کیسا ہے یہ جنون

نور شاہ





کیسا ہے یہ جنون

نور شاہ

۱۴ لل دید کالونی، غوری پورہ لنک روڈ
راول پورہ۔ سرینگر ۱۹۰۰۰۵ (کشمیر)
فون نمبر:۔ ۰۹۹۰۶۷۷۱۳۶۳

ترتیب

☆ حصہ (ج) افسانچے

انتساب

موسموں کا تو لگا رہتا ہے آنا جانا
دیکھتے دیکھتے یہ دن بھی گذر جائیں گے

بیگم نور شاہ کے نام

کیسا ہے یہ جنون

☆...... پروفیسر قدوس جاوید

نور شاہ: کشمیر، کرب، کہانی

بیانیات (Narratology) کے تقاضوں کے مطابق، افسانے کا افسانہ ہونا ضروری ہے۔ نوعیت کے اعتبار سے افسانے کا متن رومانی ہے یا حقیقت پسندانہ، سادہ و سہل ہے یا علامتی واساطیری اس کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے، لیکن اس کلیے کا اطلاق اسی افسانہ نگار کے افسانوں پر ہوسکتا ہے۔ جو افسانہ لکھتا نہیں، اپنے پورے وجود کے ساتھ افسانہ ''جیتا'' ہے، کیوں کہ افسانہ/ ناول محض لسانی وادبی اظہار نہیں، فکشن نگار کے وجود کے اندر اور باہر کی زندگی اور زمانہ کے مضمرات وامکانات کو اپنے تمام تر تخلیقی اور دانشورانہ امکانات کے ساتھ جینے کا فنی وجمالیاتی وسیلہ ہوتا ہے۔ اسی لئے آج کی تاریخ میں، دیگر اصناف کے مقابلے میں سب سے زیادہ ''سماج مرکز'' اصناف اور ناول ہی ہیں۔ ہاں، چونکہ افسانہ/ ناول کی بھی اپنی شعریات ہوتی ہے۔ لہٰذا ہر معتبر افسانہ نگار کے یہاں (جیسا کہ نور شاہ ہیں) جینے کے کسی بھی عمل اور انداز کے بیان میں اس شعریات کے احترام کے ساتھ اس کی تخلیقیت (creativity) کے انفرادوامتیاز کا چھڑکاؤ بھی لازمی طور پر سامنے آتا ہے۔

نور شاہ نے کم وبیش نصف صدی سے زائد عرصے پر محیط اپنے ادبی سفر کے دوران کتنے افسانے لکھے یہ غالباً نور شاہ کو بھی یاد نہیں ہوگا لیکن ''بے گھاٹ کی ناؤ''، ''ویرانے کے پھول''، ''ایک تھی ملکہ''، ''گیلے پتھروں کی مہک''، ''من کا آنگن اُداس اُداس''، ''آسمان پھول اور لہو''، ''بے ثمر سچ'' اور ''کشمیر کہانی'' جیسے افسانوی مجموعوں اور نیلی جھیل کالے سایے اور ''پائل کی زنجیر'' جیسے ناولوں کے علاوہ ''آدھی رات کا سورج''، ''آؤ

سو جائیں'' اور ''لمحے اور زنجیر'' وغیرہ طویل افسانوں (ناولٹوں) اور پھر حالیہ منی کہانیوں اور افسانہ اور افسانہ نگاروں سے متعلق نور شاہ کی تحریروں کا بغور مطالعہ و محاسبہ کریں اور پھر تقسیم ملک کے آس پاس سے لے کر آج ۲۰۱۳ء تک نور شاہ کی جو تحریریں تواتر کے ساتھ سامنے آ رہی ہیں ان سب کو ذہن میں رکھیں تو معلوم ہوگا کہ ابتدا میں نور شاہ نے ''بیسویں صدی'' جیسے رسالوں کے لئے جو افسانے لکھے، ان میں سے بیشتر کو ''مشقِ سخن'' کے خانے میں رکھا جاسکتا ہے۔ گرچہ اس ابتدائی دور کے بھی بعض فسانے یادگار ہیں، لیکن خاص طور پر ماہنامہ کتاب لکھنؤ، شبِ خون (الہ آباد) کے علاوہ نقوش، ادبِ لطیف (پاکستان) وغیرہ رسالوں میں نور شاہ کے جو افسانے شائع ہوئے وہ بطور خاص کشمیر کی روحِ عصر کے موثر ترجمان ہیں اور ان کے طفیل ہی خود نور شاہ کا شمار ایک عرصہ سے اُردو کے معتبر افسانہ نگاروں میں کیا جاتا ہے۔

نور شاہ کے ابتدائی افسانوں میں تخلیقِ فن کی عام روش، جمالِ فطرت سے قربت، شعورِ جسم (Body Conciousness) کی لطافت اور عام قارئین کی پسندیدگی کے سبب نور شاہ کی تخلیقیت پر حسن پرستی اور رومانیت کا غلبہ نظر آتا ہے اور بعض ناقدین کی نظروں میں رومانیت نور شاہ کے فن کی بنیادی شناخت ہے۔ نور شاہ نے اپنے افسانوی مجموعہ ''بے ثمر سچ'' میں ''اپنی بات'' کے عنوان سے اپنے تخلیق محرکات اور میلانات پر روشنی ڈالتے ہوئے خود بھی لکھا ہے:۔

''میرے افسانوں کے اکثر کردار رومانوی ہیں۔ میرا ماننا ہے کہ زندگی کے دھارے رومان کے چشموں سے ہی پھوٹتے ہیں...... زندگی حسن و عشق سے عبارت ہے اور نسل آدم کی بقا ان ہی سے قائم ہے''

نور شاہ نے اشاراتی انداز میں یہ بھی لکھا ہے کہ انہوں نے جوانی کے ایام سرینگر کے ڈل جھیل کے آس پاس اس حصے میں گذارے ہیں جہاں پہاڑ، پانی اور سبزہ بیک وقت نظر آتا ہے، وادی کے اسی حصے میں میرے احساسِ جمال کی پرورش ہوئی۔

دراصل یہ ایک نفسیاتی سچ ہے۔ مشہور ساختیاتی مفکر رولاں بارتھ (Rolland

(Barth) کا قول ہے کہ ''کوئی بھی جینوین فنکار خواہ جتنی بھی کوشش کیوں نہ کرے اپنے معاشرہ اپنی ثقافت کی جانب سے آنکھیں بند کر کے عمدہ فن پارے کی تخلیق نہیں کر سکتا۔ژولیا کرسٹیوا (julia Kristeva) نے بھی اپنی تحریر (The Desire of Language) میں کسی بھی متن، لفظ یا نظام (System) کی تشکیل کے ضمن میں انسانی ذہن کے تخلیقی رویوں سے بحث کرتے ہوئے لاشعور کی کارکردگی سے متعلق فرائیڈ کے بیان کردہ دو مرحلوں (Displacement) اور (Condensation) میں اپنی جانب سے ایک تیسرے مرحلے Passage ہے کی نشاندہی کی ہے اور کہا ہے کہ لاشعور کا یہ مقام Passage کسی بھی فنکار کے فن کے رنگ، رجحان، مزاج اور میلان کو سمت عطا کرتا ہے اور اسی کے سبب کسی کی تخلیق، رومانی یا حقیقت پسندانہ، انقلابی، مذہبی صلاحی یا ثقافتی ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ Passage ٹھوس اور جامد نہیں، سیال اور تغیر پذیر ہوتا ہے۔ چنانچہ نورشاہ ایک عرصہ تک فطرت پسندی حسن پرستی اور معاملاتِ عشق کے حوالے سے جسم و جان کے رومانی اسرار میں اُلجھے رہے اور عام قارئین کی پذیرائی، شہرت اور مقبولیت کے سبب ایک عرصہ تک انہوں نے رومانیت کا حصار توڑنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی بلکہ بعض افسانوں میں نورشاہ کا رومانی مزاج شعور کے حوالے سے ''غیر ضروری طور پر'' جنسیت'' کی حدوں کو چھوتا نظر آتا ہے، مثلاً

''۔۔۔دونوں نیم عریاں جسم فرش کی سطح پر اور بھی پھسل جاتے ہین۔ جسن بہکنے لگا ہے، دھڑکینں سلگنے لگی۔ سانسوں سے آگ برسنے لگی ہے۔۔۔ میرا جسم برف کا ڈھیر ہے۔۔۔۔ میرے جسم کی ساری گرمی پریا کے جسم میں منجمد ہو چکی ہے''۔

لیکن جنسیت کی ایسی چند ایک مثالوں کے باوجود منٹو کی طرح نورشاہ کو بھی جنس نگار نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی نورشاہ اپنے عمومی سیاق و سباق میں جنسیت کو فروغ دینے سے دلچسپی رکھتے ہیں حالانکہ اولاد آدم کی سرشت میں جنس ایک لازمہ ہے لیکن تہذیب و توازن شرط ہے۔ پروفیسر شکیل الرحمن نے نورشاہ کے اس طرح کے افسانوں کے حوالے سے کہا ہے۔ ''بلاشبہ بدن اور اس کے لہو میں جنسی ہیجان سے جو تپش پیدا ہو جاتی ہے وہ زندگی کے

سچے جنون کی دین ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر بڑا افسانہ نگار اقدار زندگی کے پیش نظر اظہار خیال میں توازن رکھتا ہے اور یہی اس تخلیقی فن کار (نور شاہ) کی کامیابی ہے''۔

لیکن یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ہر جینوین شاعر یا ادیب کسی مخصوص موضوع، اسلوب اور میلان کا مستقل پابند نہیں ہوتا، ہو بھی نہیں سکتا کیونکہ ہر عہد کے اپنے تقاضے Episteme ہوتے ہیں جن سے چاہتے ہوئے بھی شاعر یا ادیب منہ نہیں موڑ سکتا۔ دراصل آزادی/تقسیم ملک کے آس پاس سے ہی ادب بالخصوص فکشن میں جذبہ واحساس اور تخیل وتصور پر محسوس یا نامحسوس طور پر ارضیت کے حوالے سے فکر و دانش، تجزیہ ومشاہدہ اور تجزیہ وتحلیل کا غلبہ شروع ہو گیا تھا۔ کشمیر میں ۴۸-۱۹۴۷ء (تقسیم ملک)، ۱۹۵۳ء (شیخ عبداللہ کی گرفتاری)، ۷۲-۱۹۷۱ء (قیام بنگلہ دیش کے بعد شیخ عبداللہ کی اقتدار میں واپسی) اور ۱۹۸۹ء (عسکریت کا آغاز) کے حوالے سے کشمیر کی سماجیات، سیاست، معاشیات اور ثقافت میں جو غیر متوقع آثار چڑھاؤ پیدا ہوئے اس کے سبب ساٹھ سال کے عرصے پر محیط کشمیر کا یہ پورا زمانہ گویا رنج والم، جبر وزیادتی کا گواہ بن گیا۔ گھٹن سے بھرے سیاہ دنوں اور خونبار راتوں میں در و دیوار سے رونے اور سسکنے کی آوازیں آتی تھیں کچی پکی جوانیوں کی فصلیں اس طرح کاٹی جاتی رہیں گویا پوری کشمیری قوم پیدا ہی ہوئی ہے مرنے کے لئے محبت واخوت کی کوئی شاخ ہری نہیں رہی زمانے کی گردش نے ایک پر اسرار خاموشی پسار دی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کشمیر، کشمیر نہیں نامساعد حالات کی ایک کال کوٹھری ہے جس کے اندر کشمیری قوم سلاخیں تو گن سکتی ہے اس سے باہر نہیں نکل سکتی کیونکہ آزاد فضا کی طرف کھلنے والے دروازوں پر یا تو قفل ہیں یا سنگین بردار کالے دیوؤں کے سائے۔ ان حالات میں یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ نور شاہ شرافت، انسان دوستی اور فرقہ وارانہ یکجہتی کے مثالی پیکر گھروں اور دروں، دلوں اور چہروں پر پھیلی ہوئی ویرانیوں کو نظر انداز کر دیتے اور اُن کے پیچھے کی مہیب سچائیوں کو اپنی تخلیقیت اپنی دانشوری کا حصہ نہ بناتے۔

ایک وقت تھا جب دوسروں کی طرح نور شاہ کے لیے بھی کشمیر بہشت تھا جہاں ہر

چہار طرف زندگی امن و آشتی اور حسن و عشق سے عبارت تھی، بیسویں صدی کے اخیر تک نور شاہ کے اکثر و بیشتر افسانوں میں جس احساس جمال کے مرقعے یہاں وہاں نظر آتے ہیں وہ ان کے رومانی اور جمالیاتی مزاج (Aesthetic Passage) کا پرتو ہیں:

"کشمیر کی ہر چیز قابل تعریف ہے۔ ہری بھری شاداب وادی، سندر دھرتی ۔۔۔پہاڑ جن کی گود میں ہرے بھرے جنگل ہیں جو آگے آگے پھیل کر ایسی شکھر مالاوں میں بدل جاتے ہیں جہاں بارہ مہینے برف کا راج رہتا ہے۔ یہاں کے بہتے ہوئے پانی کا رنگ نیلا ہے، سبز ہے۔ یہاں پھولوں سے جڑی ہوئی مرگیں ہیں۔ رنگ برنگے پھولوں سے سجے سنورے تختے ہیں جن کی خوشبو میں سیاحوں اور یاتریوں کی سانسیں رچی بسی ہیں۔ یہ گلمرگ، یوس مرگ، پہلگام ہے یہ شالیمار ہے اور یہ نشاط ہے نور جہاں کے خوابوں کا باغ۔۔۔ یہ کل کل کرتی ندیاں،۔۔۔۔ بید کے پیڑوں کی قطاریں چنار کے پتوں کا لال رنگ ۔۔۔سفیدے کے لمبے لمبے پیڑ۔۔۔"

افسانہ۔ اندھیرے اُجالے

"سامنے کی کھڑکی کھول دو تو جھیل کے پانیوں سے ہنستے کھیلتے کنول کے پھول ۔۔۔ہاؤس بوٹوں کی لمبی قطاریں ڈوبتے اُگتے سورج کا منظر نگاہوں میں اُتھل پتھل مچا دیتا ہے خاموش راتوں کی چاندی میں پری محل کے کھنڈرات سے ان دیکھی پریوں کے گیت سنائی دیتے ہیں"۔

افسانہ۔ بے جڑ پودے

لیکن جیسا کہ جون توسا (Jahn Tusa) نے اپنی تحریر Art Matters میں کہا ہے "سچے ادیب کا فن منجمد اور یک رنگ نہیں ہوتا وقت زندگی اور زمانہ کے تغیرات کے ساتھ اس کے فن میں بھی روانی تازگی اور تہہ داری پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اپنے گرد و پیش کی آوازوں کو گرفت میں لینا، گذرے ہوئے تجربوں کو یاد رکھنا اور ہجوم کی بے چہرگی، بے سمتی اور کٹر پن (Dogmatism) کو تحلیل کرتے ہوئے اپنی فنکارانہ انفرادیت کو برقرار رکھنا

ادیب کی عظمت کی دلیل بھی ہے اور مجبوری بھی کہ یکسانیت ادب میں ہو یا زندگی میں بہر حال اُکتاہٹ پیدا کرتی ہے چنانچہ جب کشمیر کے مقدر میں ویرانیوں کی دراندازی ہوئی جہلم اور ولر کے پانی کا رنگ سرخ ہوا اور فضاؤں میں سیبوں اور ناشپاتیوں کی خوشبوؤں کی جگہ بارود کی بو نے گھیر لی تو زندگی کی طرح ادب کے تخلیقی اور فکری سروکاروں اور اظہاری رویّوں میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئیں جس کے سبب رومانیت اور تصوریت کے دلدادہ نور شاہ کا فن بھی گرینڈ دھماکوں، قتل وخوں، آبروریزی اور عدم تحفظ کے زائیدہ کشمیر کے نئے ڈسکورس کے حوالے سے بیانیہ (Narration) کے ایک نئے سانچے میں ڈھل گیا اسے حقیقت پسندانہ سماجی وثقافتی بیانیہ (Realistic Socio-Cultural Narration) کہہ سکتے ہیں لیکن اس کے باوجود نور شاہ کے ایسے افسانے صحافتی رپورٹنگ یا بے روح مرقعے نہیں ہیں ان میں وہ فنی وجمالیاتی عناصر موجود ہیں جو افسانہ کو افسانہ بناتے ہیں البتہ انھیں اگر ''ٹریجڈی کی جمالیات'' کا نام دیا جائے تب بھی نور شاہ کے ایسے افسانویت پر حرف نہیں آئے گا۔ ''خواب بھی بکتے ہیں''، ''کرب ریزے''، ''سوداگر''، ''کوئی رونے والا نہیں''، ''دِل ویراں میں کیا غم'' وغیرہ افسانے اس کی مثالیں ہیں۔ چند اقتباسات دیکھیے:

''۔۔۔۔۔اس دوران یہ جنت دھیرے دھیرے آہستہ آہستہ رُک رُک کر ایک نیا روپ اختیار کر گئی۔۔۔ جہنم کا روپ۔۔۔۔۔ آگ شعلے، قتل وا غارت، آبرو ریزی، ناانصافی۔۔۔۔۔ اور پھر ایک عجیب سی بات ہوئی۔ لگاتار بہت سے نوجوان لاپتہ ہو گئے۔ بسیار تلاش کے بعد ان کے بارے میں کوئی جانکاری نہ ملی۔ پھر ایک ہنگامہ ہوا، لوگ متحرک ہو گئے اور حراستی ہلاکتوں کے خلاف سڑکوں پر آ گئے۔ تلاش شروع ہوئی۔ کئی بے نام قبروں کی نشاندہی کی گئی اور کئی مسخ شدہ بے نام لاشیں ان قبروں سے برآمد کی گئیں۔۔۔۔''

افسانہ ''خواب بھی بکتے ہیں''

''اور پھر ایک دن صبح سویرے لوگوں کو اخبار کے فرنٹ پیج پر ایک ساتھ دو تصویریں

دیکھ کر کوئی حیرانی نہ ہوئی۔ حیرانی شاید اس لیے نہیں کیوں کہ اب ایسی تصویریں روز ہی اخباروں کے زنیت بنتی ہیں۔ کبھی ایک روپ میں، کبھی دوسرے روپ، یہ دو تصویریں بھی کچھ ایسی ہی نوعیت کی تھیں۔ ایک طرف آمنہ کے بڑے بھائی کی خون سے لت پت لاش تھی اور دوسری طرف سرکار کا ایک اعلیٰ آفیسر آمنہ کے بھائی کو ہیلنگ ٹچ کے نام پر نوکری کا حکم نامہ دے رہا تھا لیکن اس بات کی کوئی وضاحت نہ کی گئی تھی کہ آمنہ کے بھائی کو کس جانب سے گولی لگی تھی۔ کیا وہ گولی وردی میں تھی یا وردی کے بغیر اور ملٹینسی سے اس کا کیا تعلق تھا، وہ تو صرف اپنے بہنوں کا بھائی تھا۔ پھر وہ ملی ٹنٹ کب اور کیسے بنا اور کیسے ملٹینسی کا شکار ہوا۔ لیکن آمنہ اس بات سے بخوبی واقف تھی کہ صرف اپنی بہن کو روزگار دلانے کے لیے اُس کے بھائی نے ایک نیا روپ اپنا لیا تھا۔۔۔۔‘‘

افسانہ۔ ’’ہیلنگ ٹچ‘‘

’’مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے ہر کوئی رو رہا ہے، ہر کوئی چیخ رہا ہے۔ لیکن آواز سنائی نہیں دیتی۔ ہر کوئی اپنے سینے پر پتھر رکھ کر ان دیکھی آگ کی تپش میں جھلس رہا ہے۔۔۔ دن کی روشنی میں بھی مہیب سناٹوں کا احساس ہوتا ہے‘‘

ایک بات بتا دوں؟۔ ہاں بتا دیجیے۔

اب ہر چیز کے ساتھ آپ کو ’’تھا‘‘ یا ’’تھی‘‘ جوڑنا پڑے گا۔

کیا مطلب۔

جیسے۔ یہاں امن ’’تھا‘‘۔ بھائی چارہ ’’تھا‘‘۔ محبت اور چاہ ’’تھی‘‘۔ ایک دوسرے پر اعتبار اور اعتماد ’’تھا‘‘۔۔۔۔۔۔ سب کچھ نظر بد کا شکار ہو گیا‘‘۔

افسانہ۔ ’’کرب ریزے‘‘

ہاں یہ بات تو صحیح ہے کہ لڑکی نے دریا میں چھلانگ لگا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا، یا یوں کہیئے کہ خودکشی کر لی، مگر۔۔۔ مگر کیا ڈاکٹر خان؟‘‘

یہ زخم اس بات کے گواہ ہیں کہ لڑکی نے بڑی جدوجہد کی ہے۔‘‘

''اپنی زندگی بچانے کے لیے''۔

نہیں ڈاکٹر اسلم۔اپنی آبرو بچانے کے لیے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

"It is a case of gang Rape"

افسانہ۔''کوئی رونے والا نہیں''

''آمنہ بی بی جو چند روز قبل اپنی بیٹی خالدہ کے ساتھ ایک شادی میں شرکت کرنے کی غرض سے سرینگر سے بارامولا جا رہی تھی اور بس اسٹینڈ کے قریب ایک گرنیڈ پھٹنے کے دوران شدید زخمی ہوئی تھی۔کل رات زخموں کی تاب نہ لا کر اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ ان کی دس سالہ بیٹی خالدہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گئی''۔

افسانہ۔''آسمان پھول اور لہو''

''میں جب اپنے گھر کی کھڑکی سے اس کھلے کھلے سے وسیع قبرستان کی جانب دیکھتا ہوں تو مجھے ان کچی پکی قبروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔جن پر لکھی ہوئی عبارتیں اب لفظ اور دائروں میں سمٹ کر رہ گئی ہیں۔یہ مٹتے ہوئے الفاظ جیسے کوئی کہانی دُہرا رہے ہوں۔۔۔دور سے کچھ لوگ ہاتھوں میں مشعلیں لیے قبرستان کی جانب بڑھ رہے ہیں شاید ان لوگوں کی تلاش میں جو کل تک ان کے ساتھ تھے۔ان کے اپنے تھے۔ان کے وجود کا حصہ تھے۔لیکن آج قبروں میں لفظوں کی طرح سمٹ سمٹ کر دائرے بن گئے ہیں''۔

افسانہ۔''یہی سچ ہے''

دراصل کوئی بھی معتبر، مشاق اور جنیوین فن کار اپنی تخلیقیت اور اپنی بصیرتوں کا اظہار خالصتاً اپنی منشا سے نہیں ''وقت'' کے دباو اور مطالبات کی بنا پر بھی کرتا ہے۔رولاں بارتھ کا یہ قول (writing writes not authors) زبان کے مروجہ لسانی نظام اور اظہاری رویوں کے تناظر میں درست ہو سکتا ہے کہ لیکن ایلس منرو کو، جس طرح جنوبی اونٹاریو کے لوگوں کے دکھ درد، غربت و افلاس پر مبنی کہانیوں کے مجموعے (I meaning to tell have been something) پر ۲۰۱۳ء کا نوبل انعام دیا گیا اور اس کے جو اسباب

بتائے گئے ہیں ان کی بنا پر اگر یہ کہا جائے کہ time writes not authors تو شاید غلط نہیں ہوگا۔ نور شاہ نے ایک Rational افسانہ نگار کے طور پر وقت کے رواج، مزاج اور مطالبہ کے مطابق شعور و سرورِ بدن اور رومانیت پر مبنی افسانے ضروری لکھے، ایسے افسانوں میں حسن و عشق کی سحر کاری ہے۔ الفاظ و تراکیب، تشبیہات و استعارت کے انتخاب اور برتاؤ کا ماہرانہ سلیقہ ہے۔ موضوع، واقعہ اور کردار کے حوالے سے متنوع اور موزوں ترین فقرے تراشنے کی غیر معمولی خاصیت ہے۔ بیان میں منٹو کی جیسی وہ Irony ہے جس میں شگفتہ معنوی تہہ داری بھی ہے اور جارحانہ نشتر زنی بھی۔ نور شاہ کسی مخصوص سیاسی نظریہ، سماجی تصور کی حمایت یا مخالفت نہیں کرتے۔ ادب کے کسی گروہ سے بھی وابستہ نہیں۔ (اور غالباً اسی لئے ابھی تک انہیں کسی بڑے انعام سے نوازا نہیں گیا ہے) نور شاہ کے فنی و جمالیاتی لسانی و فکری امتیازات اتنے روشن اور امکانات سے پر ہیں کہ معاصر اُردو افسانہ نگاروں میں غالباً چند ایک کو ہی نور شاہ کے مدِ مقابل رکھا جاسکتا ہے۔ اور ایسا نہیں ہو رہا ہے تو غالباً اس وجہ سے کہ نور شاہ نام نہاد ادبی مراکز سے دور کشمیر کے افسانہ نگار ہیں۔ لیکن کشمیر کا افسانہ نگار ہونے کے حوالے سے بھی نور شاہ، اپنی کشمیر کی کہانیوں کے ذریعے ادب میں سچ اور صرف سچ کے ایماندارانہ بیان کا ایک نیا رجحان بھی پیدا کیا ہے اُسی طرح جس طرح مہاراشٹر میں دلت ادب کے معمار نامدیو ڈھسال نے مراٹھی ادیبوں میں بے خوف سچائیوں کے ادبی اظہار کا رجحان پیدا کیا ہے۔ لیکن ایلس منرو، نامدیو ڈھسال یا پھر منٹو کی طرح نور شاہ کی کشمیر کی کہانیاں بھی دہشت، خوف یا منافرت کے جذبات متحرک نہیں کرتے بلکہ امن و آشتی محبت و اخوت اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے قیام پر زور دیتے ہیں۔ آج کے کشمیر کے حوالے سے گذشتہ صحافت پر درج نور شاہ کے افسانوں کے اقتباسات پر غور کیجئے۔ یہ اقتباسات ایک افسانہ نگار کے قلم سے وجود میں آنے والے مرقعے ہی نہیں۔ دل پر خوں سے ٹپکے ہوئے ایسے قطرے ہیں کہ ہر قطرے میں آج کے کشمیر اور کشمیری قوم کے کرب و اندوہ کا دجلہ دکھائی دیتا ہے۔ آج کے تناظر میں یہی نور شاہ کے انفرادو امتیاز کا پورا سچ ہے۔



☆......ڈاکٹر شمع افروز زیدی

نور شاہ کی کہانیاں

نور شاہ سری نگر میں پیدا ہوئے۔ کشمیر کی خوبصورت وادیوں میں کھیل کود کر جوانی کی منزلیں طے کرنے سے قبل کہانیاں بننے لگے۔ یہاں تک کہ ان کے اس شوق نے جنون کی کیفیت اختیار کرلی۔ عمر بڑھنے کے ساتھ مزاج میں پختگی آتی گئی ساتھ ہی فن میں بھی نکھار آتا رہا اور جب نور شاہ کو یقین ہو گیا کہ وہ کہانی کہنے کے فن سے کسی حد تک واقف ہو چکے ہیں تو پہلی کہانی ''گلاب کا پھول'' ماہنامہ بیسویں صدی میں اشاعت کے لیے بجھوادی حسنِ اتفاق کہ کہانی شائع بھی ہوگئی بس پھر کیا تھا ان کے شوق کو مزید جلا ملی اور یوں وہ کہانیاں لکھنے لگے۔ پھر ان کا قلم ایسا رواں ہوا کہ آج تک نئے نئے فن پارے تخلیق کر رہا ہے۔

ماہنامہ بیسویں صدی ایسا رسالہ ہے جسے ہر عمر کے لوگ پڑھتے رہے ہیں۔ اب یہ تیسری نسل کے ذہنوں کی آبیاری کر رہا ہے۔ میرے بچپن میں یہ رسالہ ہمارے گھر میں آتا تھا اماں بڑے ذوق وشوق پڑھا کرتی تھیں۔ جب میں آٹھویں کلاس میں تھی نور شاہ کی کہانی پڑھی (نام ذہن میں نہیں) اور پھر یوں ہوا جب جب ان کی کہانیاں پڑھتی تصور کی آنکھ سے انہیں دیکھتی خود ان کی کہانیوں میں انہیں تلاش کرتی یہ تلاش اس دن ختم ہوئی جب پہلی بار ۱۹۸۱ء میں دفتر بیسویں صدی دریا گنج میں وہ نیر صاحب سے ملاقات کے لیے تشریف لائے تھے۔ سادگی و متانت کا مجسمہ، بات کرنے کا دھیما دھیما انداز محسوس ہو رہا تھا کہ یہ وہی فنکار ہے جس کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر میں نے شعور کی منزلیں طے کی ہیں۔ مزاج میں بے حد انکساری رچی ہوئی تھی۔ دورانِ گفتگو انہوں نے بتایا'' ماہنامہ بیسویں صدی میں

تخلیق کا شائع ہو جانا کسی بھی فنکار کے لیے کسی اعزاز سے کم نہ تھا گویا اس میں شائع ہونے کے بعد مستند ہونے کی مہر لگ جاتی تھی۔

نور شاہ ایسے ادیب ہیں جن کا تخلیقی سفر ۶۰ دہائیوں پر محیط ہے۔ تا حال ان کا یہ سفر اسی انداز میں رواں دواں ہے۔ ورنہ عام طور پر ہوتا یوں ہے کہ ایک خاص مدت کے بعد فنکار خود کو دہرانے لگتا ہے۔ لیکن نور شاہ کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ ان کی تحریروں میں موضوعات کا تنوع ہے۔ تخلیقی سوتے اسی طرح سرسبز و شاداب ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے نور شاہ محکمہ زراعت و دیہی ترقی میں ڈپٹی کمشنر اور ڈایریکٹر رہ چکے ہیں۔ آپ ڈایریکٹر سائنس اینڈ ٹیکنالوجی اور چیف ایکزیکٹو آفیسر جموں و کشمیر میں اہم عہدوں پر فرائض منصبی نبھانے کے ساتھ کہانیاں بھی قلمبند کرتے رہے۔ ان کارناموں کی طویل فہرست ہے۔

نور شاہ نے بے گھاٹ کی ناو، ویرانے کے پھول، من کا آنگن اُداس اداس، ایک رت کی ملکہ، گیلے پتھروں کی مہک، بے ثمر سچ، آسمان پھول اور لہو (افسانوی مجموعے) نیلی جھیل کالے سایے، پائل کی زنجیر (ناول) آدھی رات کا سورج، آؤ سو جائیں، لمحے اور زنجیریں (ناولٹ) کہاں گئے یہ لوگ (خاکوں کا مجموعہ) جیسے شہ پارے اردو ادب کو عطا کیے ہیں وہ صرف اور صرف اپنی تحریروں کے ذریعہ قارئین کے ذہن و دل پر آج بھی حکومت کر رہے ہیں۔ انہوں نے ڈرامے اور ٹی وی سیریلز بھی لکھے۔ کالم نویس کی حیثیت سے بھی اپنی شناخت قائم کی ہے۔ ان کے فن اور شخصیت پر مختلف یونیورسٹیوں سے کئی طلباء ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کر چکے ہیں۔

نور شاہ کا ذہن بے حد زرخیز اور خلاق ہے۔ پیدائشی کشمیری ہونے کے سبب وہ کشمیر کے چپے چپے سے واقف ہیں۔ وہاں کے ہر گوشے پر ان کی نگاہ ٹھہرتی ہے۔ انہوں نے کشمیر کے ہر موسم کو دیکھا اور لطف اٹھایا ہے وہاں کی صحت بخش ہواؤں اور چشموں کے ٹھنڈے اور میٹھے پانیوں سے اپنی روح کو سیراب کیا ہے۔ اس لیے ان کا قلم وہاں کی خوب صورتی اور حسن کو نہایت روانی سے صفحہ قرطاس پر بکھیرتا چلا جاتا ہے۔ در اصل ''حسن'' ایک ایسی کیفیت کا نام ہے جس سے کوئی بھی انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ

سکتا اور نور شاہ کے یہاں اس کا اظہار بھر پور انداز میں ملتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ حسن ان کے فن، ان کی زندگی اور ان کے ماحول کا حوالہ بن کر شہ پاروں کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ نور شاہ کی کہانیوں میں ان کی محبوبہ اس لیے اہم نہیں کہ وہ حسن پرستی کی تسکین کرتی ہے یا اس کی دلنواز ادائیں من کو موہ لیتی ہیں بلکہ اس کا وجود حسن کی تخلیق کا باعث بنتا ہے اور پھر وہی حسن ان کے افسانوں میں جا بجا محسوس کیا جا سکتا ہے۔ حسن پسندی میں نور شاہ کی گہری نگاہ ''بے معنی سفر'' میں ملاحظہ کیجیے:

> ''مستی میں ڈوبی دو بڑی بڑی آنکھیں کتابی چہرہ اور اس چہرے پر سرخ و سفید رنگ، نمکین چائے کے رنگ کی شلوار اور اُسی رنگ کی چست قمیض، جسم کا ایک ایک انگ، ایک ایک قوس عیاں ہے۔'' (ص ۹۱)

مجھے برسوں قبل ان کے تحریر کردہ بعض افسانے یاد آ رہے ہیں جو کہانی پن کے ساتھ ہی شاعرانہ رنگ لیے ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں کشمیر کے پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں، پُرشور دریاؤں کی گونج، سبک روندیوں کے نغمے، چناروں کے دہکتے پھول، مرغزاروں، وادیوں، چشموں، شالیمار اور نشاط باغ کے دلکش مناظر اتنی خوبصورتی سے سموئے ہوئے ہیں جنھیں صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان کی کہانیوں میں ڈل جھیل، کنول، زعفران کے پھول، انار کی کلیاں، بادام کے شگوفے، شفتالو، چشمے کا ٹھنڈا پانی، پری محل، گل مرگ، سون مرگ، ٹنگمرگ، پہلگام وغیرہ ایسی علامتیں بن کر ابھری ہیں جو ان کی تحریروں کا اہم عنصر بن گئی ہیں۔ کشمیر کی خوبصورتی، وہاں کے دلنواز مناظر، حسین وادیاں، ہرے بھرے مرغزار، روح پرور فضائیں، آبشار، سڑکیں، دریا، آسمان، درخت، جنگل، پہاڑ، جھرنے غرض وہاں کے گوشے گوشے کا حسن کشید کر کے نور شاہ نے اس خوبی سے کہانیوں کے قالب میں ڈھالا ہے کہ قاری ذہنی طور پر کشمیر کی وادیوں کی سیر کرنے لگتا ہے اور وہاں کے حُسن اور روح پرور مناظر کو اپنی مشامِ جاں میں سمونے کے لیے بے چین ہو اٹھتا ہے۔ پر تولنے لگتا ہے وہاں کے حسین نظاروں کی دید کے لیے۔ ان کے افسانے ''اندھیرے اُجالے'' میں کشمیر جنت نظیر کی تصویر ملاحظہ کیجیے:

''کشمیر کی ہر چیز قابل تعریف ہے۔ ہری بھری شاداب وادیاں اور سندر دھرتی، بھانت بھانت کے لوگوں کا گھر، پہاڑ جن کی گود میں ہرے بھرے جنگل ہیں جو آگے آگے پھیل کر ایسی شکھر مالاؤں میں بدل جاتے ہیں جن پر بارہ مہینے برف کا راج رہتا ہے۔ یہاں کے بہتے ہوئے پانی کا رنگ نیلا ہے، سبز ہے، یہاں پھولوں سے جڑی ہوئی مرگیں ہیں، رنگ برنگے پھولوں سے سجے سجائے تختے ہیں، یہ گلمرگ، سون مرگ، پہلگام، یہ شالیمار ہے، یہ نشاط ہے، نور جہاں کے خوابوں کا باغ، جہانگیر کی جوانی کی یادگار، یہ ڈل جھیل ہے اور اس پر چلتی پھرتی ننھی کشتیاں اور دلہن کی طرح سجے سنورے ہاؤس بوٹ، یہ لدر نالہ ہے، یہ کل کل کرتی ندیاں اور ان کے کنارے بید کے پیڑوں کی قطاریں، چنار کے پتوں کا لال رنگ کھیتوں میں پکے ہوئے اناج کی سرخ بالیاں......'' (ص ۸۰۔۷۹)

ایسا ہی ایک اور منظر افسانہ ''بے جڑ پودے'' میں محسوس کیجیے:

''سامنے کی کھڑکی کھول دو تو جھیل کے پانیوں سے ہنستے کھیلتے کنول کے پھول نظروں کے سامنے بکھر جاتے ہیں۔ ہاؤس بوٹوں کی لمبی قطاریں گھوم پھر جاتی ہیں۔ ڈوبتے اُگتے سورج کا منظر نگاہوں میں اُتھل پتھل مچا دیتا ہے۔ خاموش راتوں کی چاندنی میں پری محل کے کھنڈرات سے ان دیکھی پریوں کے گیت سنائی دیتے ہیں۔'' (۹۷۔۹۸)

دراصل زندگی کی بساط پر نور شاہ کا رویہ اور ان کا احساس روشن ہے اس لیے یہ کہانی اتنے بڑے خوب صورت انداز میں پیش کی ہے۔ اس کے علاوہ میرا خیال ہے ''اندھیرے اجالے'' ایسے بے لوث جذبوں کی کہانی ہے جسے نور شاہ ہی قلم بند کر سکتے تھے۔ اس کہانی میں فنکار نے انتہائی مہارت کے ساتھ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی ایکتا کی بہترین مثال پیش کی ہے۔

اس کہانی میں نصیب کور پنجاب کے گاؤں کی الھڑ اور سادہ لوح عورت ہے۔ جب وہ امجد کے بابا کو اپنا خون دیتی ہے تو اس کا بلڈ گروپ امجد کے بابا کے گروپ سے میچ

کر جاتا ہے۔ امجد کے بابا کو خون دینے کے پسِ پشت ان کی زندگی بچانے کے لیے اس کے ذہن و دل میں انسانیت کا جذبہ ہی تو کار فرما ہے، پھر وہ امجد کو راکھی باندھ کر اپنا بھائی بنا لیتی ہے۔ یہ کہانی ایسے معصوم جذبوں کی کہانی بن گئی ہے کہ اس کی اہمیت اور افادیت ہر عہد میں برقرار رہے گی۔

نور شاہ کی کہانیوں کی ایک اور خوبی بہت اہم ہے وہ ابتدائی جملوں سے ہی قاری کو اپنی جانب متوجہ کر لیتے ہیں۔ ذرا ''صلیب'' کہانی کی ابتدا ملاحظہ کیجیے:

''میں تنہا ہوں۔!

میرے آنگن میں چنار کا درخت سپید سی برف میں دبا ہوا بے حد اُداس کھڑا ہے۔ آکاش کی جانب اپنی ننگی باہیں پھیلائے دیکھ رہا ہے ہر شاخ ایک صلیب ہے اور ہر صلیب پر نڈھال عیسیٰ کو خدا کی تلاش ہے! میں کس کا بیٹا ہوں؟'' (ص ۶۸)

نور شاہ لفظوں، رنگوں، موسیقی کی دلکش تان، بانسری کی مدھر لے، وائلن کی دھن اور جسم کے آہنگ کے ذریعہ انتہائی لطیف انداز میں اپنے احساسات کو واضح کرتے ہیں لیکن خوب صورتی اور حسن کے ساتھ ہی وہ زندگی کی شنگلاخیت کا ذکر بھی اسی شدومد سے کرتے ہیں اور کیوں نہ کریں کہ موجودہ کشمیر پہلے جیسا جنت بے نظیر رہا بھی تو نہیں۔ اب وہاں نہ بانسری کی مدھر لے ہے، نہ دلوں کو موہنے والی وائلن کیس کی سُریلی تان گونجتی ہے، نہ ہی دلنواز مناظر دل کو کھینچتے ہیں، نہ وہاں کے حسین موسم کہانی کہتے محسوس ہوتے ہیں، نہ ڈل جھیل کے ٹھنڈے پانی کی سرد لہر جسم میں سرایت کرتی ہے، نہ چناد کے درختوں کی چھاؤں پُرسکون لگتی ہے پھر بھی یادِ رفتگان کے طور پر نور شاہ اپنے ماضی کے کشمیر کو تلاشتے ہوئے ضرور محسوس ہوتے ہیں۔ ایسے ماحول میں کہانی کار لکھے تو کیا لکھے کہ زندگیا کا کوئی شعبہ ایسا نہیں رہا کہ حسن و محبت اور امن کا وہ دیوتا کہاں کھو گیا ہے۔ حسین مرغزاروں اور حسن کی یہ بستی کس طرح اور کیوں کر اجڑ گئی ہے۔ اس کیفیت کو ''کوئی رونے والا نہیں'' کہانی میں محسوس کیجیے:

''یہ اب سے سات سال پہلے کی بات ہے!

اور ان سات سالوں میں یہ دھرتی اور بھی اجڑ کر رہ گئی، باغبانوں نے اپنے ہی مرغزاروں کو جلا دیا، سائبان بن کر اپنے ہی گھروں کو مسمار کر دیا، وہ ساری رونق جو ہماری زندگی کے رنگوں سے بندھی ہوئی تھی جانے کہاں کہاں کھوگئی، ہماری کھلکھلاتی بستیاں اور لہلہاتی کھیتیاں کس نے چھین لیں، کیوں اور کیسے صحرا کا روپ اپنا چکی ہے ہماری یہ شاداب زمین......اور تو اسر ڈاکٹر خان خود کسی نامعلوم بندوق بردار کی گولی کا نشانہ بنتے بنتے ابدی نیند سو گئے......کیا قصور تھا ان کا......اور ایک رات احمد فواد جرنلسٹ کے آفس میں آگ نمودار ہوئی اور آناً فاناً اس کی زندگی کا سارا اثاثہ راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو گیا......اس کی تحریریں تو سچائی کی ترجمانی کرتی تھیں!!'' (ص ۷۴)

''رات کا سورج''، ''میری کہانی کا سچ'' اور ''عکس'' بظاہر ان کی سیدھی سادی کہانیاں ہیں لیکن ان کہانیوں کے ذریعہ انہوں نے عورت کی نفسیات کو بڑی مہارت سے اُجاگر کیا ہے۔

''اشرف المخلوقات''، ''ایک لمحے کی جنت'' اور ''انجانے اتہاس کی کڑیاں'' کہانیوں کے ذریعہ نور شاہ موجودہ معاشرے میں بڑھتی ہوئی ہم جنسی کی جانب بڑے دانشورانہ اور مفکرانہ انداز میں ہماری توجہ مبذول کرائی ہے۔ ساتھ ہی بھرپور انداز میں طنز بھی کیا ہے۔ ''زمیں کھولے گی زباں اپنی'' خواب بھی بکتے ہیں''، ''ٹوٹتے لمحوں کا بیان''، ''لکیریں''، ''وہ ایک شخص تھا''۔ ''ہیلنگ ٹچ'' اور ''آسمان لہو اور پھول'' زندگی کی حقیقتوں سے پُر موجودہ کشمیر کی عکاس ایسی کہانیاں ہیں جس میں کشمیر کی وادیاں اور چشمے خون کے آنسو بہاتے محسوس ہوتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے ''ہیلنگ ٹچ'' میں کشمیر کی ایک ہلکی سی تصویر:

''رات اندھیری ہے نہ چاند کی نرم و سبک روشنی ہے اور نہ ہی ستاروں کی چمک دمک، ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک سیاہ بادلوں کا دھند لکا چھایا ہوا ہے۔ خلقت سے بھری یہ بستی خالی خالی سی نظر آتی ہے اور میں اپنے بند کمرے میں بیٹھا

سوچ رہا ہوں کہ اس مختصر سی داستان کا اختتام کب، کہاں اور کیسے ہوگا۔ دور بہت دور گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ شاید کراس فائرنگ ہو رہی ہے ان آوازوں سے ان سناٹوں میں اور بھی اضافہ ہوتا ہے اب تو یہ سناٹے نہ صرف میری بلکہ ہم سب کی زندگیوں کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔ یہ سلسلہ کئی برسوں سے جاری ہے۔ لوگ مرتے ہیں اس جانب بھی اور اس جانب بھی......'' (ص ۳۰۴)

اس پیراگراف میں شدید دُکھ کے ساتھ خون کے آنسوؤں کی آمیزش بھی ہے اور بے آواز رونے کا درد بھی، جسے محسوس کر کے دل تڑپ اٹھتا ہے یہاں تک کہ اشک رواں ہو جاتے ہیں۔ مصنف نے اس میں کشمیر کی ایسی حقیقی تصویر پیش کی ہے جس کے سبب اندر بہت اندر تک دل زخمی ہو کر پھڑ پھڑانے لگتا ہے یہاں تک کہ سموچا کشمیر بین کرتا محسوس ہوتا ہے۔

پھر بھی ایسے ماحول میں کچھ بھولی بسری یادیں اثاثے کے بطور فنکار نے سنبھال کر رکھی ہوئی ہیں۔ وہ جینے کا ماحول مہیا کرتے رہتے ہیں اور حسن کے گیت گانے پر ہی اکتفا کر لیتے ہیں کہ زندگی اسی کا نام ہے۔

''ایک خواب بے خواب سا'' ان کا ایسا افسانہ ہے جس میں دو کہانیاں ساتھ ساتھ چلتی ہیں، بظاہر دونوں کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں لیکن تعلق نہ ہوتے ہوئے بھی گہرا ربط ہے۔ اگرچہ کہانی ایک ہے لیکن دو طبقوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ ایک طبقے میں پیار محض دل بہلاوے کی چیز ہے تو دوسرے طبقے میں پیار کے نام پر جان قربان کر دی جاتی ہے۔

''پرندے میں نور شاہ بلندیوں پر نظر آتے ہیں۔ خوب صورت ڈائیلاگ، دلکش منظر کشی، ماحول کی پُراسراریت، خیال آفرینی اور جذبات کی فراوانی نے اس کہانی کو بے حد خوب صورت اور بامعنی بنا دیا ہے لگتا ہے فنکار نے اس کہانی کو بُننے میں اپنی خصوصی صلاحیتیں صرف کر دی ہیں۔ اس میں کردار بولتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اسے کردار کی کہانی کہا جا سکتا ہے جو اپنے اندر بے پناہ حسن سمیٹے ہوئے ہے۔

''بے جڑ پودے'' دو محبت بھرے دلوں کی ایسی کہانی ہے جو محبت کی پہلی ہی

سیڑھی سے پھسل کر گر پڑتے ہیں، حالات کا جبر انہیں لاچار و بے بس کر دیتا ہے اور وہ گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو کر ہمیشہ کے لیے اپنی جان کو روگ لگا لیتے ہیں۔

نورشاہ نے عورت کی عظمت، ذہانت، ارادے کی پختگی اور اس کی مظلومیت کو ہی اپنی کہانیوں کا محور نہیں بنایا ہے یا پھر انہوں نے عورت کو صرف وفا کی دیوی کے روپ میں ہی نہیں پیش کیا ہے بلکہ ان کے خیال میں بے وفا اگر مرد ہو سکتا ہے تو عورت بھی ہو سکتی ہے۔ ''خوشبو کا سفر''، ''آخری دن کی تلاش'' اور ''دوسرے شوہر کی خواب گاہ'' میں انہوں نے ایسی ہی بے وفا عورت کی تصویر پیش کی ہے۔

''گھر بے گھر'' اور ''رشتوں کی دہلیز پر'' جیسی ان کی کئی ایسی کہانیاں ہیں جو پاکیزہ جذبوں کی کہانیوں کے زمرے میں شمار کی جا سکتی ہیں۔

نورشاہ کی کہانیوں کو جستہ جستہ پڑھیے تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں ورائٹی اور تنوع ہے۔ وہ اپنی کہانیوں میں زندگی کے تلخ حقائق، نفسیاتی کشمکش، حالات اور ماحول کا المیہ اس خوبی سے سموتے ہیں کہ قاری کے ذہن و دل پر کاری ضرب لگتی ہے۔ لیکن اس کاری ضرب کو سنبھالنے کے ہنر سے بھی وہ بخوبی واقف ہیں۔ اس لیے قاری کو لطیف رومانی ماحول بھی فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور حسن کا ذکر اس دلکش پیرائے میں کرتے ہیں کہ قاری کے ذہن سے دکھوں کے بادل چھٹ جاتے ہیں۔ اور یہی خوبی انہیں امتیاز بخشتی ہے۔

''کہاں گئے یہ لوگ'' میں ۶۵ مختلف النوع شخصیات کے مختصر خاکے شامل ہیں۔ نورشاہ کی پہلی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے صاحب خاکہ کے بارے میں بہت جامع، سہل اور سرل انداز میں زندگی کے رنگوں کا اُجاگر کر کے بالکل اپنے انداز میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ ان خاکوں کی دوسری اضافی خوبی یہ ہے کہ قاری انہیں پڑھتے ہوئے اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا بلکہ روانی، شگفتگی اور اختصار کے سبب پڑھتا چلا جاتا ہے۔ نورشاہ نے ہر خاکے میں اس طرح رنگ بھرا ہے کہ اس کی شخصیت پوری طرح اُبھر کر قاری کو متاثر کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

نور شاہ کی دوسری تخلیقات میں 'بند کمرے کی کھڑکی' جموں وکشمیر کے اردو افسانہ نگار اور کشمیر کہانی شامل ہیں۔ بند کمرے کی کھڑکی میں انہوں نے اپنی ادبی زندگی کی کھٹی میٹھی یادوں کو ڈائری کے اوراق میں سمیٹا ہے۔ نور شاہ نے افسانوی اسلوب دے کر ڈائری کے اوراق پر بکھری ہوئی کہانیوں کو بہت ہی دلچسپ اور دل آویز بنایا ہے۔ بند کمرے کی کھڑکی میں ریاست کی سماجی، ادبی، علمی اور ثقافتی پہلوؤں کی عکاسی ملتی ہے۔ بہت سارے علمی اور ادبی واقعات سامنے آتے ہیں۔ جموں وکشمیر کے اردو افسانہ نگار پڑھ کر جموں و کشمیر کے اردو افسانہ نگاروں کے بارے میں بھرپور جانکاری ملتی ہے۔ اُن کی ایک کہانی کا تجزیہ ملتا ہے اور ڈرامائی روپ بھی، بقولِ پروفیسر مجید مضمرؔ جموں وکشمیر کے افسانہ نگار تصویروں کی ایک نمائش ہے، ہر تصویر منفرد ہے۔ تصویروں کا یہ البم ریاست میں اردو افسانے کے پیچ وخم کو بھی ظاہر کرتا ہے اور افسانہ نگاروں کے احوال اور کوائف سے بھی واقف کراتا ہے۔ کشمیر کہانی میں نور شاہ کے وہ افسانے اور ڈرامے پڑھنے کو ملتے ہیں جن کا تعلق کشمیر کے پُرآشوب دور سے رہا ہے۔ کشمیر کہانی دراصل کشمیر میں ہونے والے افسوسناک اور المناک واقعات کی منظر کشی کرتی ہے۔ یہ کہانیاں لکھتے ہوئے نور شاہ نے ایک کیمرہ مین کا روپ اپنا لیا ہے اور واقعات ومناظر کی عکس بندی جارت اور چابکدستی سے کی ہے۔ ان افسانوں اور ڈراموں میں آہوں، سسکیوں اور درد وکرب کے مناظر ہوتے ہوئے بھی مایوسی کا عنصر نظر نہیں آتا۔

نور شاہ کا بیانیہ پختہ، دلکش اور رواں دواں ہے، وہ لفظوں کے اُلٹ پھیر میں قاری کو نہیں الجھاتے۔ بوجھل اور ثقیل الفاظ سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کے قلم میں تازگی ہے۔ زبان سلیس، سادہ اور پُرکار ہونے کے علاوہ کرداروں کی زبان سے جملوں کی فطری ادائیگی کہانی کار کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اسی سبب نور شاہ کی تحریروں میں پڑھے جانے کی ایسی بھرپور قوت ہے کہ عام قاری بھی اسے نہایت دلچسپی سے آخر تک پڑھ کر ہی دم لیتا ہے اور یہی خوبی فنکار کی سب سے بڑی کامیابی ہوتی ہے۔



☆......دیپک بدکی

نور شاہ کا تخلیقی سفر
رومانیت سے حقیقت نگاری تک

نور شاہ ایک ایسے تخلیق کار ہیں جو اپنے دل میں پون صدی کے تغیرات، انقلابات، قوم کا المیہ، اپنوں سے بچھڑنے کا غم اور انسان کا درد و کرب لیے ہمیں آج بھی اپنے رومانی افسانوں، ناسٹلجیائی یادداشتوں، دلفریب خاکوں اور پارینہ روزنامچوں سے محظوظ کررہے ہیں۔ تقریباً ساٹھ سال پہلے انھوں نے سجاد حیدر یلدرم سکول کی پیروی میں اپنا ادبی سفر شروع کیا تھا جس کی آبیاری گزشتہ صدی میں ماہنامہ 'بیسویں صدی' نئی دہلی کرتا رہا۔ نور شاہ کی اکثر و بیشتر کہانیاں اسی رسالے میں چھپتی رہیں اور قارئین کی دلچسپی کا مرکز بنتی رہیں۔ عشق و محبت کی ماورائی کہانیاں، افلاطونی کردار اور جمالیاتی موضوعات۔۔۔۔! نور شاہ نے خود بھی رومان پرور طبیعت پائی ہے جو حسن و جمال کی انتہا دیکھنے کی متلاشی ہے۔ ان کے بارے میں عبدالقادر سروری فرماتے ہیں:

"نور شاہ وادی کے افسانہ نگاروں میں غالباً سب سے زیادہ لکھنے والے افسانہ نگار ہیں۔۔۔۔۔ کہانی لکھنے میں انھیں نہ صرف ذوق ہے، بلکہ سلیقہ اور اچھا سلیقہ ہے۔ ایک اچھے افسانہ نگار کی طرح وہ ہر موضوع سے ایک مؤثر افسانہ اور ہر موقف سے دلچسپ مرقع پیدا کر سکتے ہیں جہاں ان کے موضوع میں دم نہیں، اسے بھی اپنے پیش کشی کے انداز اور فنی چابک دستی سے وہ جیتا جاگتا بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

سینکڑوں کردار انھوں نے پیدا کیے ہیں، تاہم ان میں یکسانیت بہت کم ہے، وہ حقائق کے افسانے لکھتے ہیں، لیکن رومانی حقائق کے۔

۔۔۔نور شاہ کرداروں کی بیرونی رنگ کاری کے علاوہ اکثر ان کے بطون کی گہرائیوں میں بھی جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں۔۔۔۔

افسانوں میں ڈرامائی موقف پیدا کرنے کی وہ شعوری کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔"

(عبدالقادر سروری، 'کشمیر میں اردو'، جے اینڈ کے اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگوئیجز، سرینگر، کشمیر، تیسرا حصہ، ۱۹۸۴ء، ص ۲۵-۲۲۴)

نور محمد شاہ (قلمی نام: نور شاہ) ڈل گیٹ، سرینگر میں ۹ رجولائی ۱۹۳۶ء کو پیدا ہوئے اور بی اے کی تعلیم حاصل کر کے گورنمنٹ کے ملازم بن گئے۔ وہ ریاست جموں وکشمیر کے محکمہ زراعت و دیہی ترقی میں ڈپٹی کمشنر کے عہدے پر تعینات ہوئے، پھر ترقی پا کر ڈائریکٹر محکمہ دیہی ترقی، ڈائریکٹر سائنس اینڈ ٹکنالوجی، اور آخر میں چیف ایگزیکیوٹیو افسر جے اینڈ کے انرجی ڈیولپمنٹ ایجنسی کے پوسٹ سے سبکدوش ہو گئے۔ ان دنوں سازگار ادبی ماحول کے سبب ڈل گیٹ سرینگر سے کئی ادیب سامنے آتے رہے۔ خود ان کے خاندان میں سبھی بھائی اردو ادب کی طرف مائل تھے۔ اس علاقے کی خصوصیت یہ ہے کہ پس منظر میں شنکر آچاریہ کی پرشکوہ پہاڑی ہے اور پس منظر میں جھلمل کرتی ہوئی ڈل جھیل ہے جو سارے ماحول کو پرکیف بناتے ہیں۔ پھر گرمیوں میں خوشبوئیں بکھیرتے ہوئے سیاحوں کے خوشنما قافلے سونے پر سہاگا کا کام کرتے ہیں۔ اسی ماحول سے ترغیب پا کر نور شاہ نے افسانے کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا اور عمر بھر اس کے ہو کر رہ گئے۔ اس بارے میں خود ہی فرماتے ہیں:

"دراصل وادی کے جس حصے میں میں نے اپنا بچپن اور لڑکپن گزارا ہے اور جوانی کے ایام جیے ہیں، وہ ڈل جھیل کے آس پاس کے کچھ حصے ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں پہاڑ، پانی اور سبزہ بیک وقت نظر آتا ہے۔ کہنا یہ ہے کہ وادی کے اسی حصے میں میرے احساس جمال کی پرورش ہوئی ہے اور وہ حسن جو میری آنکھوں نے سمیٹ لیا ہے لاشعوری طور پر میری کہانیوں میں منعکس ہے۔

(نور شاہ، افسانوی مجموعہ 'بے ثمر سچ'، امیکس بکس، حضرت بل، سرینگر، کشمیر ۲۰۰۵ء، ص ۸)

نورشاہ کو بچپن ہی سے افسانہ نگاری کا شوق رہا لیکن ان کی ادبی زندگی کی باضابطہ شروعات ۱۹۵۸ء میں ہوئی۔ چونکہ ابتدا میں چند ایڈیٹروں نے ان کے افسانے لوٹا دیے اس لیے انھوں نے اپنی کہانیاں چھپوانے کا ایک انوکھا طریقہ اختراع کیا اور وہ تھا اپنے نام کے بدلے 'شاہدہ شیریں' کے فرضی نام سے افسانے بھیجنا۔ ایڈیٹر حضرات اس خوبصورت نام پر لٹو ہو گئے اور کہانیاں دھڑا دھڑ چھپنے لگی۔ بے شمار خطوط بھی آتے رہے جن میں تقرّب حاصل کرنے کی خواہشوں کا مکرر اظہار ہوتا۔ آخر کار 'شاہدہ شیریں' تقلیب ماہیت پر مجبور ہوئی اور وہ 'نورشاہ' بن کر سامنے آئی۔ بقول نورشاہ ان کا یہ دور کافی من چلا اور جیوٹ رہا۔ کئی معروف ادباء کے خطوط ملے جن سے ان کی دو نیم شخصیتیں سامنے آگئیں۔ گفتگو کے دوران میں نے ان سے التماس کی تھی کہ ان خطوط کو شائع کروالیں مگر ان کی شرافت، حلیمی اور وفاداری انھیں ایسا کرنے سے باز رکھتی ہے۔ ۱۹۵۹ء میں 'ہمارا ادب' کے انتخاب کے لیے ان کی ایک کہانی 'گلاب کا پھول' چن لی گئی جس میں پروفیسر حامدی کاشمیری نے آخر کار نقاب الٹ دیا:

"'بے گھاٹ کی ناؤ' کا خالق نورشاہ نقلی نسوانی لبادے اتار کر، اب اصلی صورت میں ہمارے سامنے آرہا ہے اور ہماری آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر رہا ہے۔"

(بحوالہ 'نورشاہ'، جموں وکشمیر کے اردو مصنفین، جان محمد آزاد، جے اینڈ کے اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز، سرینگر کشمیر، ص ۱۸۸)

نورشاہ کی پہلی کہانی ماہنامہ 'بیسویں صدی' نئی دہلی میں بعنوان 'گلاب کے پھول' چھپی تھی جبکہ ان کا پہلا ڈرامہ 'دل کی روشنی' ریڈیو کشمیر سرینگر پر نشر ہوا تھا۔ ان کی تخلیقات کی تفصیل یوں ہے۔ افسانوی مجموعے: ۱) بے گھاٹ کی ناؤ، ۲) ویرانے کے پھول، ۳) من کا آنگن اُداس اُداس، ۴) ایک رات کی ملکہ، ۵) گیلے پتھروں کی مہک، ۶) بے ثمر سچ ۲۰۰۵ء، ۷) آسمان، لہو اور پھول؛ ناول: ۸) نیلی جھیل کے سائے، ۹) پائل کے زخم؛ ناولٹ: ۱۰) آؤ سو جائیں، ۱۹۷۱ء ۱۱) آدھی رات کا سورج، ۱۲) لمحے اور زنجیریں؛ دیگر تصانیف: ۱۳) انتخاب اردو ادب، ریاست جموں وکشمیر ۴۷ء تا ۷۱ء - ایک جائزہ؛

۱۴) بند کمرے کی کھڑکی، ۲۰۰۷ء (ڈائری)، ۱۵) کہاں گئے وہ لوگ، ۲۰۰۹ء (خاکے)؛ ۱۶) ریاست جموں وکشمیر کے اردو افسانہ نگار۔ تعارف فن اور مکالمے، ۲۰۱۱ء (تجزیہ)۔ انھوں نے اپنی کئی کہانیوں کو کشمیری میں بھی ترجمہ کیا ہے۔ رؤف راحت نے مندرجہ بالا تین ناولٹوں کو یکجا کر کے 'نور شاہ کے تین ناولٹ' عنوان سے ۲۰۰۹ء میں دوبارہ شائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ نور شاہ نے ساٹھ سے زائد ریڈیو ڈرامے لکھے ہیں جو ریڈیو کشمیر سرینگر اور جموں سے نشر ہو چکے ہیں۔ ریڈیو کشمیر کی ہی کمرشل براڈ کاسٹنگ سروس سے ان کی تیس سے زیادہ گیتوں بھری کہانیاں نشر ہو چکی ہیں۔ مزید برآں دوردرشن سرینگر کے لیے انھوں نے کئی ٹیلی ویژن سیریل جیسے 'درد کا رشتہ'، 'گل اور بلبل'، 'تلخیاں' اور 'سفر زندگی کا' وغیرہ تحریر کیے ہیں۔ افسانہ نویسی اور ڈرامہ نگاری کے علاوہ نور شاہ نے وقتاً فوقتاً کئی رسالوں کی ادارتی ذمہ داریاں بھی سنبھالیں اور کچھ برس پہلے کشمیر عظمیٰ کے لیے کالم نویسی بھی کی۔ کشمیر عظمیٰ سے وابستگی کے دوران ہی وہ اپنے ذہن کی دبیز تہوں کو کھنگالتے رہے جس کا ثمر ہمارے سامنے 'بند کمرے کی ڈائری' اور 'کہاں گئے وہ لوگ' کی صورت میں نمودار ہوا۔ نور شاہ کی افسانہ نگاری کے بارے میں ڈاکٹر برج پریمی اپنے خیالات کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''نور شاہ بنیادی طور پر شاعرانہ ذہن رکھتے ہیں۔ ان کا اسلوب بھی شاعرانہ ہے جس سے ان کی کہانیوں میں قوس قزح کے رنگ آ گئے ہیں۔ اور اس خصوصیت نے نور کے افسانوں کو ایک انفرادیت بخش دی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ نور شاہ افسانہ بُننے کے گر سے بھی واقف ہیں۔ وہ انسانی زندگی کی مجبوریوں اور ناکامیوں کی کہانیاں لکھتے ہیں۔ جس سے ان کے افسانوں میں غم کی ہلکی ہلکی کسک پیدا ہو گئی ہے۔ 'بے گھاٹ کی ناؤ'، 'من کا آنگن اداس اداس' اور 'گیلے پتھروں کی مہک' جیسے افسانے قابل قدر ہیں اور ہمارے افسانوی ادب میں اضافہ۔''

(ڈاکٹر برج پریمی، 'اردو افسانہ ریاست میں'، انتخاب اردو ادب، ۷۴ء تا ۷۱ء، نور شاہ ۱۹۷۲ء)

ان کے افسانوں کے مجموعے 'بے ثمر سچ' پر راقم الحروف کے تبصرے کا اقتباس

بھی یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''نور شاہ افسانے لکھتے وقت 'ستیم ،شِوم اور سندرم' کی کھوج میں نکلتے ہیں۔وہ نہ صرف عورت کے حسن سے متاثر ہیں بلکہ مناظر قدرت سے بھی جھوم اٹھتے ہیں۔ بہر حال عورت ان کے تخیل پر حاوی رہتی ہے۔اس عورت میں وہ دوشیزہ کی پاکیزگی بھی دیکھتے ہیں اور ماں کی ممتا بھی۔ بیوی کی رعنائیاں بھی ڈھونڈتے ہیں اور کسبی کی شہوت انگیز انگڑائیاں بھی۔''

(دیپک بُدکی ،تبصرہ 'بے ثمر سچ' عصری تحریریں ،میزان پبلشرز ،سرینگر کشمیر ،ص ۸۴)

مذکورہ مجموعے (بے ثمر سچ) کی کئی کہانیاں بہت متاثر کرتی ہیں جیسے وہ جو ایک شخص تھا،لکیریں وغیرہ۔مجموعے میں شامل کچھ افسانوں کے اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

☆ ''یہ زندگی ایک کہانی ہے اور اس کہانی میں ماضی کے کچھ حسرت بھرے لمحے حال کی بے پناہ اداسیاں اور مستقبل کی ان دیکھی ان جانی پرچھائیاں پوشیدہ ہیں''

(رات کا سورج)

☆ ''کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ ہم کس دور میں سانس لے رہے ہیں۔ہم کس سماج اور کس سوسائٹی کی تخلیق کر رہے ہیں۔یہاں ہر شے میں بناوٹ ہے،ملاوٹ ہے،ہماری باتیں ،ہماری سوچیں بھی تو نقلی ہیں۔سبھی پر ملمع چڑھا ہوا ہے۔''

(بے جڑ پودے)

☆ ''ہر شاخ ایک صلیب ہے اور ہر صلیب پر نڈھال عیسیٰ کو خدا کی تلاش ہے!''

(صلیب)

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ابتدا میں نور شاہ کے افسانوں میں رومانیت غالب رہی اور نفسیاتی واہ واہی (Appreciation therapy) کے باعث وہ اس ڈگر پر بہت عرصہ تک گامزن رہے۔البتہ ان کا افسانہ وقت کے ساتھ ساتھ ارتقا کی منزلیں طے کرتا رہا اور حقیقت پسندی کے نزدیک آنے کی کوشش کرتا رہا۔چنانچہ ان دنوں ترقی پسند تحریک اپنے زوروں پر تھی اس لیے نور شاہ نے بھی غریبوں اور مفلسوں کی حمایت

میں افسانے لکھے مگر انھوں نے نہ اپنا اندازِ بیان ترک کیا اور نہ ہی اپنے افسانوں کو فوٹو گرافی یا تحریکی منشور بننے دیا۔ اس بارے میں عبدالقادر سروری فرماتے ہیں:

"اس عہد کے افسانہ نگاروں کی طرح انھیں بھی مظلوم اور مفلوک انسانوں سے ہمدردی ہے، اکثر افسانوں میں انسان دوستی کے جذبے کا کام لیتے ہیں۔ کشمیری عوام کی زندگی، ان کے جذبات، ان کے رنج و غم، ان کی مسرتوں، ان کی تمناؤں اور خواہشات کے کتنے ہی مرقعے ان کے افسانوں کی کثیر تعداد میں ملتے ہیں۔"

(عبدالقادر سروری، 'کشمیر میں اردو'، جے اینڈ کے اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز، سرینگر کشمیر، تیسرا حصہ، ۱۹۸۴ء، ص ۲۲۴)

نورشاہ کے افسانوں پر جدیدیت کا اثر بہت کم نظر آتا ہے۔ وہ استعاراتی و علاماتی چیستاں سے پرہیز کرتے ہیں اور اپنے جذبات کا اظہار کھل کر کرتے ہیں۔ انھوں نے بیانیہ کا خوب استعمال کیا ہے حالانکہ مکالمہ کو بھی ضرورت کے مطابق کام میں لاتے ہیں۔ بقول رؤف راحت "۔۔۔۔۔۔ یہاں تک کہ قاری کی موت واقع ہوتی اگر نورشاہ جیسے تخلیق کار نہ ہوتے۔" (رؤف خیر، حرفِ چند، نورشاہ کے تین ناولٹ، میزان پبلشرز، سرینگر، کشمیر، ۲۰۰۹ء ص v) اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انھوں نے علامتوں کا استعمال کبھی نہیں کیا۔ ان کے کئی افسانوں میں کتا، چنار، سفید رنگ، اور برف وغیرہ بطور علامت استعمال ہوئے ہیں۔ مگر ان علامتوں کو وہ منزل نہیں سمجھ بیٹھے بلکہ ان کو منزل تک پہنچنے کا ذریعہ بنالیا۔

نورشاہ کے افسانوں کی ایک اور خوبی ان کی منظر نگاری ہے۔ وہ قاری کے ذہن پر مطلوبہ منظر کا ہو بہو عکس بنانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کے افسانے اندھیرے اجالے، بے جڑ پودے، لکیریں قابل غور ہیں۔ اچھا ڈرامہ نگار ہونے کے سبب ان کے افسانوں میں ڈرامائیت بھی ملتی ہے۔ ان کے مکالمے جچے تلے اور چست ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں وہ طنز کا برمحل استعمال کرتے ہیں۔ نورشاہ کے افسانوں کا اختتام بھی عنوان ہی کی طرح چونکانے والا ہوتا ہے۔ جہاں تک کرداروں کا سوال ہے وہ باہر سے

زیادہ کردار کے درون میں جھانکتے ہیں۔ کردار کی نفسیاتی کشمکش، الجھن اور کجروی کو وہ بڑی ہنرمندی سے پیش کرتے ہیں اور شجرِ ممنوعہ کے پھل کو چکھنے سے گریز نہیں کرتے۔ چنانچہ اپنے کرداروں کے بارے میں خود ہی لکھتے ہیں:

''میرے افسانوں کے اکثر و بیشتر کردار رومانوی ہیں۔ میرا ماننا ہے کہ زندگی کے دھارے رومان کے چشموں سے پھوٹتے ہیں۔ میرا ایسا سوچنا بجا بھی ہے کہ زندگی حسن و عشق سے عبارت ہے اور نسل آدم کی بقا ان ہی سے قائم ہے۔''

(نور شاہ، افسانوی مجموعہ 'بے ثمر سچ'، امیکس بکس، حضرت بل، سرینگر کشمیر ۲۰۰۵ء، ص ۸)

جیسے کہ پہلے ہی ذکر آچکا ہے کئی افسانوں میں کرداروں کی نفسیاتی کجرویوں کو اجاگر کیا گیا ہے مثلاً دستک ــــ Electra complex ؛ صلیب Sexual dissatisfaction ؛ وہ جو ایک شخص تھا، زمین کھولے گی زبان اپنی، اور آخری دن سے پہلے Guilt Complex ، ؛ رات کا سورج Oedipus complex ؛ ایک لمحے کی محنت Sodomy ؛ اشرف المخلوقات اور انجانے اتہاس کی کڑیاں Lesbianism WifeSwapping وغیرہ۔ اس کے باوجود وہ ان معاملوں پر کھل کر نہیں لکھتے بلکہ بڑی ہی سنجیدگی کے ساتھ اور سلجھے ہوئے طریقے سے مسئلے پر روشنی ڈالتے ہیں۔

کشمیر افسانہ نگار کا اوڑھنا بچھونا رہا ہے۔ وہ اسی دھرتی پر پیدا ہوئے، پلے بڑھے اور زندگی کے نرم و گرم سے جوجھتے رہے۔ ان کے اکثر افسانوں میں کشمیر کا عکس بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر ملتا ہے۔ مجموعہ 'بے ثمر سچ' کے کئی افسانے کشمیر سے تعلق رکھتے ہیں۔ جیسے 'ٹوٹتے لمحوں کا بیان' 'لکیریں' وغیرہ۔ افسانہ 'اس کی گلی کا پاپ' میں کشمیر کے موجودہ ماحول کی منظر نگاری بالواسطہ طور پر یوں کی گئی ہے:

''اب یہاں کوئی ہنگامہ نہیں، کہیں کوئی چیخ نہیں، کوئی شور نہیں۔ برف کی سفید روشنی میں ساری گلی اونگھ رہی ہے، سارا ماحول تھکا تھکا اور سویا سویا سا ہے جیسے اب کوئی یہاں نہیں رہتا۔ یہ انسانوں کی بستی نہیں قبرستان ہے، سارے مکان سارے گھر برف کی قبریں ہیں اور ان میں رہنے والے لوگ برف کی مورتیاں، بے حس بے

جان، یخ ٹھنڈی لاشیں، مسخ شدہ چہرے، گوشت پوست کے بغیر جسم، خالی خالی بے رس ہڈیاں۔ اب یہاں وہ آواز بھی نہیں جو دل کے جنگل میں محبت کی کوئی قد آور شاخ بلندی سے پستی کی جانب ٹوٹنے سے بے ساختہ نکلتی ہے اور چند لمحوں کے لیے دل کی دنیا میں ایک مرگ آلودہ سناٹا چاروں سمت پھیلا دیتی ہے۔!!

بیسویں صدی کے آٹھویں دہے میں کشمیر میں جو انقلاب آیا اس نے یہاں کی زندگی کا نقشہ ہی بدل ڈالا۔ ایک ایسے قلم کار کے لیے جو چالیس سال اپنے رومانی خامہ کو جمالیات کی روشنائی میں ڈبو ڈبو کر حسن و جمال کے پیکر بناتا رہا اور جو ہمیشہ کہتا رہا کہ ''ہم سب کا جسم ایک ہے، جسم کی بناوٹ ایک ہے، جسم کے اندر خون ایک ہے، خون کا رنگ ایک ہے، تو پھر یہ فرق کیوں۔۔۔؟''، اس کے لیے یہ ایک بہت بڑے امتحان کا وقت آن پڑا تھا۔ اس کے ہم راہی کچھ تو راہ عدم اختیار کر چکے تھے، کچھ وادی کو الوداع کہہ چکے تھے اور کچھ ترقیم سے تائب ہو چکے تھے۔ وہ اکیلا، لاچار و بے بس ایک جانب اپنی دھرتی کا بلاتکار ہوتے دیکھ رہا تھا اور دوسری جانب اپنی قوم کا شیرازہ بکھرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے اندر سوئی ہوئی روح جاگ اٹھی، ایک نئی توانائی نے پھر سے جنم لیا، اس کے سوچ و فکر میں کافی تبدیلی آئی اور وہ اپنے شہر آشوب کا نوحہ رقم کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اب وہ غریب معصوم کشمیریوں کے بہتے لہو کو قرطاس پر جمع کر کے اس کا کولاج بنانے لگا، ان کی خاموشیوں کی صدا سننے کے لیے اپنے کان دھرنے لگا، ان کی محرومیوں کا دکھ درد بانٹنے لگا اور ان کی بے زبانی کو زبان دینے لگا۔ اس حوالے سے ماہنامہ 'بیسویں صدی' دہلی کی ایڈیٹر ڈاکٹر شمع افروز زیدی فرماتی ہیں:

> ''نورشاہ ایک جانب لفظوں، رنگوں موسیقی کی دلکش تان، بانسری کی لے، وائلن کی دھن اور جسم کے آہنگ کے ذریعہ انتہائی لطیف انداز میں اپنے احساسات کو واضح کرتے ہیں تو دوسری جانب زندگی کی سنگلاخیت کا ذکر بھی اسی شدومد سے کرتے ہیں اور کیوں نہ کریں کہ موجودہ کشمیر پہلے جیسا جنت بے نظیر رہا بھی تو نہیں۔ اب وہاں نہ بانسری کی مدھر تان گونجتی ہے، نہ ہی دل نواز مناظر دل کو موہ لیتے ہیں، نہ

وہاں کے حسین موسم کہانی کہتے محسوس ہوتے ہیں، نہ ڈل جھیل کے ٹھنڈے پانی کی سرد لہر جسم میں سرایت کرتی ہے، نہ چنار کے درختوں کی پُرسکون چھاؤں میسر آتی ہے اور نہ وہاں کی وادیاں سرگوشیاں کرتی محسوس ہوتی ہیں لیکن یادِ رفتگاں کے طور پر نورشاہ اپنے ماضی کے کشمیر کو تلاشتے ہوئے ضرور محسوس ہوتے ہیں۔''

نورشاہ کے تین ناولٹ 'آدھی رات کا سورج'، 'آؤ سو جائیں'، 'لمحے اور زنجیریں' ان کے شروعاتی دور کی تخلیقات ہیں اس لیے ان میں بھرپور رومانیت نظر آتی ہے۔ ان تینوں ناولٹوں کو رؤف خیر نے ۲۰۰۹ء میں دوبارہ مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ یہاں بھی نورشاہ نے رومانیت کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ان ناولٹوں کے کرداروں میں عجیب سا لاابالی پن ملتا ہے اور کشمیر کے حسین مناظر کے ساتھ ساتھ اوبرائے ہوٹل میں ماضی کی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ ناولٹ 'آؤ سو جائیں' پر اعجاز صدیقی، ایڈیٹر ماہنامہ شاعر ممبئی لکھتے ہیں:

''' آؤ سو جائیں' جہاں ایک لمحے کی کہانی ہے، وہیں ایک ـــــ یگ کی کہانی بھی ہے۔ اس ناولٹ میں نورشاہ نے ایک خاص ماحول اور اس ماحول میں رہنے والے کرداروں کی نقاب کشائی اپنے منفرد ڈھنگ سے کی ہے۔''

(حرفِ چند، نورشاہ کے تین ناولٹ، مرتبہ رؤف خیر، میزان پبلشرز، سرینگر، کشمیر، ۲۰۰۹ء ص vi)

نورشاہ نے گزشتہ کئی برسوں سے اپنی ڈائری کے صفحات اور اپنی یادداشتوں کو قرطاس کے حوالے کر دیا ہے۔ ان خاکوں اور ماضی کے واقعات کو پڑھ کر قاری ایسے محسوس کرتا ہے کہ وہ رائٹر کی یادوں کے البم کی ورق گردانی کر رہا ہے۔ 'بند کمرے کی کھڑکی' ان کی ڈائری کے چنندہ اوراق پر مشتمل ہے جن کی ترتیب تاریخ کی بجائے موضوعیت پر دی گئی ہے۔ اس ڈائری میں ۴۴ ادیبوں وصحافیوں، ۳ فلمی شخصیتوں، ۳ مصوروں و مجسمہ سازوں، ایک موسیقار، اور ۲ ادبی تنظیموں کا ذکر آچکا ہے۔ اس سے بڑھ کر اس ڈائری سے خود قلم کار کی شخصیت کے پوشیدہ پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔ ان کی نیک نیتی، ہمدردی اور اصول پرستی کی بھی تصدیق ہوتی ہے۔ گاندھی جی کے اصولوں کی ان دیکھی، فرقہ وارانہ فسادات نیز

انسانی اقدار کی پامالی پران کا دل رنجیدہ ہوجاتا ہے۔ چنانچہ کشتواراور بھدرواہ کے دورے پروہاں کی حالت دیکھ کروہ اپنے تاثرات یوں بیان کرتے ہیں۔

''ایک ڈر کا ماحول ہر سمت پیدا ہوگیا اور اس کا ذمہ دار کون ہے؟ خود ہم لوگ، ہمارے رہنما اور سیاست دان، ہمارا معاشرہ، ہمارا انتظامیہ۔۔۔کوئی بھی آدمی جنم سے بُرا نہیں ہوتا۔تو کیا یہ مادہ پرست دنیا ہے جو آدمی کو کرپٹ Corrupt کرتی ہے۔۔۔۔یہ سوال میں اپنے آپ سے بھی کرتا ہوں اور آپ سے بھی۔۔۔!''

ماحولیات پر نورشاہ کی فکر مندی اس بات سے ثابت ہوتی ہے کہ انھیں ایک جانب ڈل جھیل کے پاس اپنے مکان کے کھونے کا غم ستاتا ہے اور دوسری جانب ڈل جھیل کی آلودگی پریشان کردیتی ہے۔ اِدھر جہلم دریا کے بہاؤ کی کمی دیکھ کر وہ مایوس ہوتے ہیں اور اُدھر سکڑتے ہوئے ولر جھیل کو دیکھ کر۔ انھوں نے اردو کے پرخلوص خادم اور بیسویں صدی کے ایڈیٹر خوشتر گرامی سے ہوئی دھوکے بازی کو اسی شدت سے بیان کیا ہے جس شدت سے انھوں نے اپنے کھوئے ہوئے یار دوستوں کے بارے میں لکھا ہے۔ 'یادوں کی مہک' کے عنوان سے نورشاہ نے کشمیری پنڈت کلچر اور پنڈت ادیبوں پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے اپنے پنڈت دوستوں کا بھی ذکر کیا ہے اور ان کے ساتھ ہمدردی بھی جتائی ہے۔ اس ڈائری کے بارے میں عمر مجید لکھتے ہیں کہ

''نورشاہ نے ہفتہ وار ایک ادبی ڈائری لکھنے کا فریضہ اپنے کندھوں پر لیا اور ادبی شخصیات اور عصر حاضر کے ادبی حالات وواقعات کو اپنے منفرد اور مخصوص انداز میں پیش کرنے لگے۔ یہ محض ایک خانہ پری نہ تھی بلکہ ایک بامقصد کوشش تھی جسے بڑے ذوق وشوق سے پڑھا جاتا ہے۔ یہ برصغیر کی ادبی دنیا کے لیے نئی چیز ہے۔''

(عمر مجید، 'فلک رنگ تاثرات'، بند کمرے کی کھڑکی، نورشاہ، ص ۹۰-۱۸۹)

اسی نہج کی ایک اور کتاب 'کہاں گئے وہ لوگ' کے عنوان سے سامنے آئی ہے جس میں نورشاہ نے ۶۷ شخصیات پر اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ اس کے علاوہ خود ان کے فن

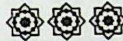
پر لکھی گئی آرا کو بھی شامل کرلیا گیا ہے۔اس کتاب میں اردو کے ادیب ہیں جیسے پردیسی، موہن یاور، ابن صفی، جگن ناتھ آزاد، کرشن چندر، ساحر لدھیانوی، مخدوم محی الدین، حکیم منظور، خواجہ احمد عباس، شکیل الرحمٰن؛ کشمیری ادب سے وابستہ قلم کار ہیں جیسے اختر محی الدین، دینا ناتھ نادم، موتی لال ساقی، فاضل کاشمیری؛ کشمیری دانشور ہیں جیسے پی این پشپ، منشی محی الدین فوق، محی الدین حاجنی؛ صحافی ہیں جیسے ملک راج صراف؛ فلمی ہستیاں ہیں جیسے محمد رفیع، پرتھوی راج کپور، نور جہاں، مدھو بالا، نوشاد علی، امجد خان؛ ریڈیو دور درشن سے وابستہ آرٹسٹ ہیں جیسے بنسی نردوش، شجاع سلطان؛ غرض ایک کہکشاں ہے جوان صفحات پر سجائی گئی ہے۔ طوالت کی وجہ سے یہاں پر پوری فہرست نہیں دی گئی ہے البتہ یہ کہنا ضروری ہے کہ جن لوگوں کے خاکے اس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں ان میں سے اکثر کے ساتھ نور شاہ کے قریبی تعلقات رہے ہیں جبکہ دوسرے لوگوں سے وہ ملے بھی نہیں ہیں مگر وہ اپنی زندگی میں کسی نہ کسی موڑ پر ان سے کافی متاثر ہو چکے ہیں۔ کتاب میں کئی ایسی باتیں درج کی گئیں ہیں جو قارئین کی دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہیں۔

'جموں وکشمیر کے اردو افسانہ نگار۔ تعارف، فن اور مکالمہ' کے عنوان سے نور شاہ کی ایک اور دستاویز ۲۰۱۱ء میں شائع ہوئی جس میں انھوں نے چند مضامین کے علاوہ ریاست کے ۶۰ افسانہ نگاروں کے مختصر کوائف، ان کے ایک چنندہ افسانے کا تجزیہ اور افسانے کے ایک سین کو مکالمی روپ دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے سمندر کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ مشمول افسانہ نگاروں میں وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے آزادی سے پہلے قلم اٹھایا تھا اور وہ بھی ہیں جو ابھی بھی طفل مکتب ہیں، وہ ادیب بھی ہیں جو شہابِ ثاقب کی طرح ادبی افق پر نمودار ہو کر ٹوٹ گئے اور وہ بھی ہیں جو عمر بھر ادب کی آبیاری کرتے رہے، کشمیر سے ہجرت کرنے والے وہ قلم کار بھی ہیں جنھوں نے تقسیم وطن کے دوران سرحد پار اپنی بستیاں بسائیں اور وہ مہاجر بھی ہیں جنھوں نے ۱۹۹۰ء میں ملک کے مختلف علاقوں میں پناہ لی۔

آخر میں مجھے یہ بات کہنے میں ذرا بھر بھی ہچکچاہٹ نہیں ہے کہ ایک ایسے ادبی

سفر کو، جو نصف صدی پر محیط ہو، چند صفحات میں سمیٹنا بہت مشکل کام ہے۔ تاہم میری یہ کوشش رہی ہے کہ کم سے کم ان صفحات میں نور شاہ کی حصولیابیوں کا اعتراف کرسکوں اور آئندہ نسلوں کو یہ بتاسکوں کہ ایسے بھی جیالے اردو ادب کی آبیاری میں مصروف رہے ہیں۔ نور شاہ کے تخلیقی سفر کا مجموعی تاثر پروفیسر مجید مضمر نے بڑی ہنرمندی سے مندرجہ ذیل الفاظ میں سمیٹ لیا ہے۔

''رومان سے حقیقت تک کے سفر میں نور شاہ کا تخلیقی برتاؤ ریاست میں اردو افسانے کو ہئیتی اور موضوعاتی سطح پر کئی نوح کے تجربات سے آشنا کرتا رہا اور اردو افسانے کے مجموعی رعالمی سرمائے میں یہاں کے خارجی اور داخلی منظر کے حوالے سے اسے ایک انفرادعطا کرتا ہے۔''



☆......ڈاکٹر اشرف آثاری

نور شاہ۔ میری نظر میں

زندگی میں مختلف تجربات و مشاہدات سے ہر اُس فردِ بشر کو لامحالہ طور پر گزرنا ہی پڑتا ہے جو اپنے اندر شعور و احساس رکھتا ہے۔ زندگی ہمیں نمرود کی طرح ہی جلتے ہوئے الاؤ میں دھکیل دیتی ہے تو کبھی مسیح ابن مریم کی طرح ہی سولی پر چڑھا دیتی ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے حصے کا زہر پی لیتا ہے اور پھر اپنے اوپر ہر لمحہ، ہر پل گزرنے والے حادثات و واردات کی روداد اپنے اپنے منفرد و مخصوص لب و لہجے میں سنا دیتا ہے۔ مصوّر، تصویروں کی زبان سے، شاعر اشعار میں اور افسانہ نویس یا کہانی کار اپنے افسانوں یا کہانیوں سے۔ یہ سب زندگی کے چہرے پر پڑی ہوئی دھول، جھاڑ کر اس کا اصلی چہرہ سامنے لانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں اور نظروں سے اوجھل ہوتی ہوئی صداقتوں کو منظرِ عام پر لانے کے لیے جہاد کرتے ہیں اور اپنی دبی ہوئی آواز کو، اپنی فنکارانہ صلاحیتوں سے اُجاگر کرنے، اظہار کا لبادہ اوڑھا دیتے ہیں۔

وادیٔ کشمیر سے تعلق رکھنے والے کہانی کار نور شاہ کا نام، نہ صرف ملکی سطح پر ہی اردو کہانی کاروں کی فہرست پر، ایک نمایاں جگہ پر، نصف صدی پر محیط ان کی انتھک کاوشوں اور کوششوں سے آیا ہے بلکہ اردو زبان و ادب کے عالمی منظر نامے پر بھی انہیں ایک قابلِ قدر مقام حاصل ہو چکا ہے۔

نور شاہ کی اکثر کہانیوں کو پڑھ کر، اس بات کا بخوبی احساس ہو جاتا ہے کہ نور شاہ فکری و جذباتی اعتبار سے کبھی کبھی ایک باغی کی طرح ہی ظلم و بربریت کے خلاف، ایک ہاتھ میں پرچم اور دوسرے ہاتھ میں قندیل لیے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن اس جوش و جذبے کی فراوانی و جدت کے باوجود بھی انہیں روایات سے پاسداری کا احساس اور خیال جابجا

رہتا ہے۔نورشاہ کی نثر نگاری میں ایک خوبصورت آہنگ بھی ہے ایک دلفریب ترنم بھی ہے ایک انقلابی کا جوش بھی ہے ایک صوفی یا مجذوب کی پُر معنویت وابہام اور گہرائی وگیرائی بھی ہے ایک شاعر کا آہنگ بھی ہے اور ایک مغنی کا ترنم بھی ہے ان کی تحریروں میں توانائی بھی ہے کہ مردہ دلوں میں پھر سے ایک نیا ہی جوش وولولہ پیدا کردے۔قوتِ استدلال اتنا توانا ہے کہ افلاطون کو بھی بے بس ولاچار کردے۔

نورشاہ کی تحریروں کے پیچھے جو جذبہ کارفرما ہے وہ دراصل لاتعداد انسانی خصائل سے گندھا ہوا ہے اوراس میں ان سب قوت بخش اجزاء کی آمیزش ہے جو انسان کی فطرت کا خاصہ ہے شاید اسی لیے یہ ہر قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں چھوڑتا۔نورشاہ کے ہاں استعاروں اور تشبیہات کی نوعیت بھی الگ ہی ہے وہ اپنی کہانیوں میں واقعات وخیالات کو صرف بیان کرتے ہوئے ہی نظر نہیں آتے بلکہ روبروان کا مشاہدہ کراتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں وہ بھی بلیک اینڈ وائٹ میں نہیں بلکہ رنگین تصاویر کے ذریعے سے،جن کا ایک ایک رنگ خوبصورت اوراچھوتا ہوتا ہے جو قاری کو اپنے ہی رنگ میں رنگ دیتا ہے۔

نورشاہ کی کہانیوں کے مطالعے سے ان کی ہمہ گیر مطالعے کا،ان کے زورِ قلم کا،ان کے وسیع وعریض مشاہدے کا پتہ چلتا ہے اوراس بات کی جانکاری بھی حاصل ہوجاتی ہے کہ ان کے پاس الفاظ کا ذخیرہ کتنا وسیع ہے۔خیالات کی فراوانی بھی ہے کہ اپنے چاروں سمت وہ راستہ دکھلادیتے ہیں ان کا نقطۂ نظر کتنا واضح اور صاف ہے۔زندگی سے متعلق حقیقتوں اور صداقتوں کا چہرہ خواہ مخواہ مسخ کرنے کا رجحان ان کے ہاں قطعی نہیں ہے اور نہ ہی ازلی اور ابدی برہنہ سچائیوں پر مصلحت اندیشی کا پردہ ڈال کر اپنا مطلب نکالنے کا رجحان ان کے ہاں ہے۔ان میں سچائی، خواہ وہ کتنی ہی تلخ وتند کیوں نہ ہو،پیٹھ پیچھے نہیں،بلکہ منہ کے سامنے بتانے کی ہمت بھی ہے اور حوصلہ بھی،زندگی سے متعلق اصل حقائق کا بھرپور مشاہدہ کرنے کا اشتیاق،ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے نئی اور غیر دریافت شدہ راستوں اور پگڈنڈیوں کی تلاش وکھوج،ان کا مقصدِ حیات ہے خواہ وہ راستے کتنے ہی مسدود ہی کیوں نہ دکھائی دے رہے ہوں۔

نورشاہ کے اندر فن کار،واہموں اوراندیشوں میں گھرا ہوا ہرگز نہیں ہے اور نہ ہی

کسی مایوسی یا قنوطیت کا ہی شکار ہے بلکہ وہ اس طرح کی ناموافق سچویشن کو بھی ایک اڈونچر کی طرح لیتا ہے اور آگے بڑھتا رہتا ہے ہاتھ پاؤں سمیٹ کر اپنی بے بسی پر ماتم کرنا اسے قطعی پسند نہیں ہے وہ اپنے آس پاس کے کرداروں کے ساتھ ہی گھل مل کر خود بھی ایک فعال رول ادا کرتا ہے۔

زندگی کے بارے میں نور شاہ کا نظریہ ہرگز منفی (Negative) نہیں ہے۔ بلکہ مثبت (Positive) ہے وہ ہمیشہ حقیقت کے متلاشی دکھائی دیتے ہیں ان کی مثالوں، ان کی فکری صلاحیتوں اور بصیرتوں، اور ان کے طرزِ استدلال سے ہی ان کی افتادِ طبع کا سراغ ملتا ہے اور اگر وہ کبھی اپنے تصورات وخیالات کا مینار لرزتا ہوا بھی دیکھتے ہیں تو وہ ہرگز مایوس نہیں ہو جاتے اور نہ ہی اپنے ہاتھ پیر سمیت کر کنارے پر بیٹھ کر تماشائی بن جاتے ہیں بلکہ وہ منہدم اور مسمار شدہ مینار کے ملبے پر ہی ایک اور اونچا مینار تعمیر کرنے میں جٹ جاتے ہیں۔

نور شاہ کی اکثر کہانیوں کے کردار ہمارے آس پاس اٹھتے بیٹھے اور چلتے پھرتے کردار ہوتے ہیں جو مایوسیوں اور محرومیوں کے باوجود بھی مجموعی طور پر اعتماد بھروسے کی فضا میں سانس لیتے ہوئے نظر آتے ہیں خوف، پریشانیاں، گھٹن، افلاس اور سر پر منڈلاتے ہوئے موت کے سائے انہیں ضرور پریشان کر دیتے ہیں لیکن وہ اس سب کے باوجود بھی راہ فرار اختیار نہیں کرتے بلکہ زندگی سے متعلق سچائیوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لیے ڈٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔

سبھی زبانوں کے ادب میں، ہر دس سال کے بعد انقلابی تبدیلیاں رونما ہو جاتی ہیں اور ایک نئے ہی دور کا آغاز ہو جاتا ہے بدلتے ہوئے حالات اور فکر وسوچ میں تبدیلی سے تخلیق ہونے والے ادب کو ایک نئی سمت اور جہت مل جاتی ہے جو کسی نئے دور کے آغاز کا باعث بن جاتی ہے نور شاہ ایک کہانی کار کی حیثیت سے پچھلی نصف صدی سے جمے رہنے کے باوجود بھی، کسی اس طرح کی تحریک سے وابستہ نہیں رہے اور نہ ہی کسی خاص نظریئے کے ڈھنڈورچی ہی بن گئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہی رونما ہونے والی خوشگوار تبدیلیوں کو انہوں نے خندہ پیشانی سے قبول کیا جن سے ان کی فکر وسوچ میں پختگی ونکھار بھی

آ گیا اور ایک استحکام بھی اور یہ عمل اب تک بالکل جاری ہے۔ ان کے تجربات و مشاہدات میں کافی وسعت و گہرائی آ گئی، زبان و بیان پر ان کی گرفت اور بھی مضبوط و مستحکم ہو گئی انہوں نے اپنے تخلیقی رجحانات پر کوئی لیبل نہیں چڑھنے دیا اور وہ ابتداء سے ہی جس منفرد و مخصوص ڈگر پر چل رہے تھے۔ اسی ڈگر پر چل کر انہوں نے اپنا ایک تشخص اور اپنی ایک الگ پہچان بنائی نصف صدی کا عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی وہ اپنے منصب پر ڈٹے ہوئے ہیں اور انہوں نے اپنے میدانِ طبع پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔

نور شاہ نے اپنے فلسفے اور اپنی فکر کو کسی خاص مقصد یا زاویہ نظر تک محدود نہیں رکھا۔ آپ اس نور شاہ دیکھ سکتے ہیں جو اپنے افسانہ نگاری کے کیریئر کے ابتدائی ایام میں ایک نسوانی نام سے کہانیاں لکھتے تھے اور پھر سبک رفتاری سے گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ ہمرقاب ہو کر ''کشمیر کہانی'' تک پہنچ گئے نصف صدی گزر جانے کے باوجود بھی کہانی تخلیق کرنے کا جنون، آج تک ان کے اندر ذرا بھی ٹھنڈا نہیں پڑ گیا بلکہ اس لمبے تخلیقی سفر کے ہر پڑاو پر پہنچ کر وہ سستی اور کاہلی کے شکار ہونے کے بجائے تازہ دم ہو کر آگے بڑھ رہے ہیں ہر مرحلے پر انہوں نے تازہ اور خوشگوار ہوا کے جھونکوں کو خوش آمدید تو کہا لیکن خود کو کسی ہوائی ریلے کے ساتھ بہنے نہ دیا۔

ترقی پسند تحریک، جدیدیت اور مابعد جدیدیت وغیرہ کے ادوار سے وہ خود بھی گزر چکے ہیں انہوں نے رنگارنگی کے عالم میں بھی اپنے مخصوص و منفرد رنگ کو اس قدر جاذب نظر اور ہر دلعزیز بنایا کہ وہ آج بھی اُسی آب و تاب کے ساتھ اردو کے معیاری رسائل و جرائد میں نمایاں جگہ پاتے ہیں اور ان کے لاتعداد قارئین انہیں کافی پسند بھی کرتے ہیں اور ان کی کہانیاں آج بھی اردو حلقوں میں زیرِ بحث آتی رہتی ہیں یہ اس بات کا ایک بین ثبوت ہے کہ انہوں نے اپنی ڈھلتی ہوئی عمر اور بزرگی کو، اپنے مضبوط و مستحکم ارادوں اور مستقبل کے تخلیقی منصوبوں پر ہرگز حاوی نہیں ہونے دیا اور نہ ہی تھک ہار کر انہوں نے، کسی چنار کے سائے میں پڑاو ڈالا ہے اس کے برعکس وہ اردو کے ہر معیاری رسالے کے ذریعے آج بھی اسی شد و مد سے اپنی موجودگی اور اپنی جہد مسلسل کا پتہ دے رہے ہیں جس کے وہ عادی رہ چکے ہیں۔

۷۸۶

اپنی بات

گزشتہ پچاس برسوں سے افسانوی ادب کے ساتھ میرا گہرا تعلق رہا ہے یا یوں کہیے کہ افسانہ لکھنے کی میری عمر پچاس برس سے کچھ اوپر ہے اور یہ سلسلہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے جاری ہے۔ آج تک میں نے کتنے افسانے لکھے ہوں گے اُن کی تعداد میرے ذہن میں محفوظ نہیں ہے۔ برصغیر میں شائع ہونے والے مختلف جرائد اور رسائل میں میری کہانیاں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اب تک میرے آٹھ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ میں نے جو ناول/ ناولٹ لکھے ہیں اُن کی تعداد پانچ ہے۔ ریڈیو کے لیے ڈرامے بھی لکھتا ہوں۔ ریڈیو سے نشر ہونے والے میرے تحریر کردہ ڈراموں کی تعداد ستر (۷۰) سے تجاوز کر چکی ہے۔ میری تحریر کردہ کچھ سیریل ٹیلی کاسٹ بھی ہو چکے ہیں۔ ادبی سفر کے دوران میری جو دوسری تخلیقات منظر عام پر آئی ہیں اُن میں سے صرف تین ایسی تخلیقات کے تعلق سے بات کرنا چاہوں گا۔ جو اپنی نوعیت، موضوع اور اندازِ تحریر کے اعتبار سے بالکل مختلف ہیں۔ اور یہ تخلیقات ہیں......!

بند کمرے کی کھڑکی (۲۰۰۷ء)

یہ ڈائری کے اوراق پر مشتمل ہے۔ ڈائری لکھنا گویا کسی منظر کو کیمرے میں اُتار دینے کے مترادف ہے۔ گزرے کل کے لاشعور کو گوشے میں بند کرنا ہے۔ یہ ایک ادبی داستان ہے جو ریاست میں گزشتہ نصف صدی میں اہم ادبی کارناموں، واقعات اور یہاں کے ادیبوں کے جذبات کی عکاسی کرتی ہے!

کہاں گئے یہ لوگ (۲۰۰۸ء)

اس میں شامل کالموں میں، میں نے ریاست اور ریاست سے باہر کے چند اہم مقبول و معروف قلم کاروں کی ادبی اور علمی عظمتوں کو اپنے انداز سے اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہاں گئے یہ لوگ دراصل ایک تصویر خانہ ہے اور اس تصویر خانہ میں بہت سی نئی پرانی تصویریں نظر آتی ہیں۔ اس میں شامل تحریروں میں مختلف علمی اور ادبی شخصیات کی زندگی اور اُن کے کارناموں کے تعلق سے جانکاری ملتی ہے۔

جموں و کشمیر کے اردو افسانہ نگار (۲۰۱۱ء)

اس میں ریاست سے تعلق رکھنے والے ساٹھ سے زائد افسانہ نگاروں کی نقاب کشائی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ ایک تعارف ہے اُن کی شخصیت اور فن کے تعلق سے، ایک مکالمہ ہے اُن کے تحریر کردہ افسانوں کے پسِ منظر میں۔ یہ تخلیق ریاست میں اردو افسانے کے پیچ و خم کو بھی ظاہر کرتی ہے اور افسانہ نگاروں کے احوال و کوائف سے بھی واقف کراتی ہے۔

اور اب ''کیسا ہے یہ جنون'' پیشِ خدمت ہے۔ میں نے اپنے جنون کو ایک نئے انداز سے پیش کرنے کی جسارت کی ہے۔ اس کتاب کے مختلف باب ہیں۔ یہ گوشے، یہ باب میں نے یوں ترتیب دیئے ہیں۔

الف) افسانے اور افسانچے　　ب) سیلاب کی کہانیاں

ج) کشمیری کہانیوں کے اردو روپ　　د) بچوں کی دنیا

م) فلمی فیچر (علمی اور ادبی پسِ منظر میں)　　ل) ریڈیائی ڈرامے

کیسا لگا میرا جنون آپ کو............ آپ کی گرانقدر رائے کا انتظار رہے گا!

سرینگر، اپریل ۲۰۱۵　　نور شاہ



افسانے

پشکر ناتھ اور علی محمد لونؔ
کی محبت بھری یادوں کی نذر!

کیسا ہے یہ جنون

درد کا کوئی وقت نہیں!

میرا نام عامر ہے اور میری عمر لگ بھگ بارہ برس کی ہے، بھلا بارہ برس کی عمر بھی کوئی عمر ہوتی ہے، یہ تو کھیلنے کودنے، ہنسنے ہنسانے اور گلی ڈنڈا کھیلنے کی عمر ہوتی ہے، زندگی کے طویل سفر میں بارہ برسوں کی بہت زیادہ اہمیت نہیں ہوتی لیکن جب بچپن اور لڑکپن کے مٹھاس بھرے دن تلخیوں اور کڑواہٹوں کی نذر ہو جاتے ہیں، کھیل کود کے ایام جدوجہد اور کشمکش کا روپ اختیار کر لیتے ہیں تو ذہن میں اپنی کم علمی اور کم فہمی کے باوجود کئی سوال ابھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان سارے سوالوں کا میری زندگی ہی سے تعلق ہے سب سے بڑا سوال تو یہ ہے کہ آخر میں ہوں کون؟ کس کا بیٹا ہوں، کہاں ہیں میرے ابو؟ جب سے ہوش سنبھالا ہے تو میں نے اپنے آپ کو اپنی ماں یا اپنی دادی کی گود میں دیکھا ہے، آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا بہاتے بہاتے بھی وہ میرے لئے ہنستی ہیں، مسکراتی ہیں، ان کے رخساروں پر رکے آنسو جب میرے چہرے کو چھوتے ہیں تو میرا سارا جسم لرزلرز سا جاتا ہے، وہ میری ہر بات، ہر چیز، ہر ضرورت کا خیال رکھتی ہیں تا کہ مجھے اپنی اس مختصر زندگی میں کسی کمی کا احساس نہ ہو، میری امی مجھ سے بے انتہا پیار کرتی ہے، مجھے بے انتہا چاہتی ہے، ایک لمحے کے لئے بھی مجھے اپنے آپ سے دور نہیں رکھنا چاہتی۔ شاید اس لئے بھی کہ مجھ میں ابو کی دوری کا احساس نہ جاگے........ ویسے بھی میں نے اپنے ابو کو اپنے گھر میں دیکھا ہی کہاں ہے، کہتے ہیں جب میں صرف چھ ماہ کا تھا تو میرے ابو نے ایک دوسرا گھر بسا لیا اور تب ہی سے وہ اسی گھر میں رہ رہے ہیں۔ اب تو بارہ برسوں سے وہاں رہ رہے ہیں، ایک ایسے گھر میں

جہاں وہ تنہا ہیں، اکیلے ہیں، جہاں تنہائیوں کے اندھیرے لمحہ لمحہ مسلط رہتے ہیں جہاں نہ تو آسمان نظر آتا ہے اور نہ ہی زمین، جہاں نہ تو موسم اور نہ ہی دھوپ چھاؤں کا احساس ہوتا ہے جہاں ہر سے ایک جیسا رنگ نظر آتا ہے، کالا سیاہ رنگ.........زندگی کے اندھیروں کی طرح، کیسی زندگی جی رہے ہیں وہ اور کس کے لئے جی رہے ہیں میرے لئے میری امی کے لئے یا میری دادی کے لئے ہمارے دکھ سکھ کے لئے، زندگی کا یہ روپ انھیں پسند کیوں ہے، اپنے گھر میں سب کچھ میسر ہونے کے باوجود انھیں، یہ تنہائی قبول کیوں ہے؟ کوئی دس ماہ قبل جب میں اپنی امی کے ساتھ ان سے ملنے گیا تھا تو مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ ان کی دو آنکھیں مجسم سوال بن کر میری طرف دیکھ رہی ہیں، میں نے دیکھا ان آنکھوں میں معصومیت ہے اور حیرانی بھی، محبت ہے اور روکھا پن بھی، شرافت ہے اور شکایت بھی، علمی بصیرت ہے اور کچھ بہت کچھ لکھنے کی چاہ بھی، مجھے لگا جیسے ان آنکھوں کو تاریخ کی گم شدہ کڑیوں کی تلاش ہے، جانے کب یہ گم شدہ کڑیاں تاریخ کے اوراق پر نمودار ہوں گی۔

دفعتاً سلاخوں کے ادھر سے میرے ابو کی آوز گونجی۔

''ساجدہ، میری زندگی کے اس سفر میں تمہیں کتنے دکھ جھیلنے پڑ رہے ہیں مجھے اس کا پورا پورا احساس ہے، اپنی تنہائی کے عالم میں بھی میرے بیٹے کا کس قدر خیال رکھتی ہو اس حقیقت سے بھی میں نا آشنا نہیں ہوں، میری ماں بیمار رہتی ہے اس کے بوڑھاپے کا سہارا بن کر تم مجھ پر جو احسان کر رہی ہو وہ میں فراموش نہیں کر سکتا۔ لیکن......؟

''لیکن کیا......میں نے کبھی آپ سے کوئی شکایت کی، کوئی شکوہ کیا؟''

''نہیں، کبھی نہیں، لیکن مجھے تمہاری تنہائی کا احساس ہے اور اس بات کا دکھ بھی ہے کہ میں تمہارے جوان اور سندر خوابوں میں رنگ نہ بھر سکا''۔

''فضل ایک بات پوچھوں۔''

''ہاں ضرور''

''تم نے اپنے ذہن و جگر میں جو خواب سجائے ہیں کیا وہ کبھی سچائی کے دامن کو چھو لیں گے رنگ بھرنے سے پہلے ٹوٹ تو نہ جائیں گے؟''

''خواب ہمیشہ جاگنے سے پہلے ہی ٹوٹ جاتے ہیں۔لیکن جب میرے خواب ٹوٹ جائیں گے تو نئی صبح طلوع ہو چکی ہوگی''۔

''مجھے ڈر لگتا ہے!''

''ڈر......کس سے، کس بات سے۔''

''تمہاری تنہائی، تمہارے اکیلے پن سے۔''

''تنہا تو تم بھی ہو۔''

''لیکن میرے پاس میرا بیٹا ہے، ماں ہے......اور تم۔''

''میں اکیلا ہوں، تنہا ہوں، یہی کہنا چاہتی ہو نا تم......لیکن مجھے یہاں نہ تو تنہائی محسوس ہوتی ہے اور نہ ہی اکیلا پن، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میرا راستہ سچائی کی جانب جاتا ہے اور سچائی کے اس راستے پر میں اکیلا نہیں ہوں، تم میرے ساتھ ہو، میری ماں میرے ساتھ ہے، میرا عامر میرے ساتھ ہے......اور......اور......''

''اور کیا''

''اور میرا اللہ میرے ساتھ ہے، میری دھرتی کے ان گنت لوگ اس راستے کی تلاش میں میرے ساتھ ہیں، تو پھر ڈر کس بات کا۔''

میں نے ایک بار پھر اپنے ابو کی آنکھوں میں جھانکا۔وہ آنکھیں ان کے لب ولہجہ میں پوشیدہ سچائی کی عکاسی کررہی تھیں۔مجھے لگا جیسے سخت ترین چٹانوں سے مٹھاس اور شرینی سے بھرپور چشمے اُبلنے والے ہوں، بانجھ زمین کی گود سے سپید سپید سی کونپلیں پھوٹنے والی ہوں، ان گنت سوکھی اور مرجھائی ہوئی ٹہنیوں پر لاتعداد رنگ رنگ کے پھول کھلنے والے ہوں۔''

درد کا کوئی مقام نہیں!

پچھلے چند دنوں سے میں اپنی امی کو بے حد پریشانی کے عالم میں دیکھ رہا ہوں جیسے اس کی روح سلب ہوگئی ہو، سانسیں رک گئی ہوں اور آنکھوں میں پگھلتی شمع کی طرح آنسوؤں کی لڑیاں رواں ہوں!

اور وادی ماں جیسے تڑپ تڑپ کر بکھر چکی ہے صرف اس کی آواز سنائی دے رہی ہے۔

''بیٹی اب جو میں مروں گی تو میرا رونے والا کوئی نہ ہوگا، مجھے کندھا دینے والا کوئی نہ ہوگا''۔

''نہیں ماں'' ایسا مت سوچو، ایسا نہیں ہوگا، نئے موسم کی ابتداء ہونے والی ہے اس نئے موسم میں تمہارے بیٹے کی آواز بے صدا نہیں جائے گی۔ مجھے پورا یقین ہے ماں فضل کی بے گناہی تسلیم کی جائے گی، اس کے ساتھ انصاف ہوگا اور وہ لوٹ آئے گا۔ نئے موسموں کی آواز سن کر......

درد کی کوئی انتہا نہیں!

سرد سرسی صبح کی روشنی نے اپنا دامن پھیلانا شروع کر دیا ہے اللہ اکبر کی صدائیں گونجنے لگی ہیں، میں اپنے گھر کے برآمدے میں بیٹھا ان گنت لوگوں کو دیکھ رہا ہوں، مرد، زن اور بچے جو اس برف باری کے باوجود ہمارے گھر کے آنگن میں جمع ہو چکے ہیں، سارا ماحول جذباتیت اور حساسیت میں ڈوب چکا ہے اشکوں کے منڈلانے سیلاب کو روکنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔

''آخر انہوں نے سچائی کو تختہ دار پر چڑھا ہی دیا۔''

یہ آواز میرے کانوں سے ٹکراتی ہے، میں ڈر سا جاتا ہوں، اپنے آپ کو تنہا تنہا محسوس کرنے لگتا ہوں، میری نظریں امی کو تلاش کر رہی ہیں، دادی ماں کو ڈھونڈ رہی ہیں، وہ اس ہجوم میں نظر نہیں آ رہی ہیں، ان کو تلاش کرنا میرے لئے ممکن نہیں۔ وہ دونوں بھی شاید اب اس ہجوم کا حصہ بن چکی ہیں۔ تو کیا میں اب بالکل اکیلا رہ گیا ہوں، لیکن یہ میں کیا سوچ رہا ہوں مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہیے، میں سچ بولنے والوں کے اس ہجوم میں اکیلا نہیں ہوں، یہ سب میرے ساتھ ہیں، میرے اپنے ہیں۔ ابو جی کی طرح ان سب کو بھی سچائی کی تلاش ہے لیکن کیا...... سچائی کے لئے ان سب کو بھی میرے ابو کی طرح تختہ دار پر چڑھایا جائے گا؟''

یہ میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں، آپ سے جاننا چاہتا ہوں لیکن آپ خاموش کیوں ہیں، کچھ تو بولئے، کچھ تو بتایئے، آپ شاید اس کشمکش میں پڑ گئے ہیں کہ بھلا بارہ برس کی عمر ایسے سوال پوچھنے کی عمر ہوتی ہے، یہ عمر تو کھیلنے کودنے، ہنسنے ہنسانے اور گلی ڈنڈا کھیلنے کی عمر ہوتی ہے۔

سفر زندگی کا

نام تو میرا نمرتا ہے لیکن میں اپنے گھر والوں کے لئے نمی ہوں اور ڈاکٹر نمرتا اُن سب لوگوں کے لئے جن کو میرے پیشے سے واسطہ پڑتا ہے اور اُن اجنبیوں کے لئے بھی جو مختصر سے واقفے ہی میں میرے ذہن پر نہ مٹنے والے نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔

اُن میں سے ایک سیما بھی تھی!

جس سے میں اُس رات متعارف ہوئی جب میں اپنی تعلیم مکمل کر کے دہلی سے گھر لوٹ رہی تھی۔

اُس دِن میں بے قرار سی تھی، پریشان سی تھی اور ہاں خوش بھی تھی۔ پریشان اور بے قرار شاید اس لئے کہ میں اُس ماحول کو چھوڑ رہی تھی جس نے مجھے اپنے آپ کو سنوارنے کا موقع بخشا تھا۔ اُن ساتھیوں کو چھوڑ کر جا رہی تھی جنہوں نے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا تھا اور خوش اس لئے کہ مجھے دوسرے لوگوں کی زندگیاں بچانے اور سنوارنے کا سلیقہ آ چکا تھا۔

ہاں تو میں اُس رات کی بات کر رہی تھی جب گاڑی چل پڑی۔ زنانہ ڈبے کے اندر کافی شور تھا۔ میں اپنے ہی خیالوں میں کھوئی اپنے من ہی من میں سوچ رہی تھی کہ ہماری زندگی بھی تو ایک گاڑی ہی ہے جسے کھینچنے کے لئے ہم آخری دم تک جدوجہد کرتے ہیں۔ اسے منزل تک پہنچانے کے لئے ہم کئی ٹیڑھے راستوں سے گزرتے ہیں، اس اُمید کے سہارے کہ آنے والی راہ ہماری مشکلیں آسان کر دے گی۔

شاید میں اپنی ہی سوچوں میں گُم رہتی کہ ایک کھنکتی ہوئی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"بہن! اگر تم یہ کھڑکی بند کر دو تو......"

میں نے اپنی گردن ذرا اُونچی کی۔ آواز کی طرف دیکھا تو میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ ایک خوبصورت لڑکی بیٹھی تھی۔ لابنے لابنے بال، سُرخ وسپید چہرہ، خوبصورت ابرو، ستواں ناک لیکن آنکھوں میں وحشت اور پریشانی صاف نظر آ رہی تھی۔

''ضرور، کیوں نہیں۔''

میں نے کھڑکی بند کرنے کی کوشش کی۔ کواڑ سخت تھے۔ وہ اُٹھی اور میری مدد کرنے لگی۔

''مجھے نمرتا کہتے ہیں۔''

وہ مُسکرائی تک نہیں۔ صرف ہلکے سے انداز میں ہونٹ کھولے۔

''مجھے سیما کہتے ہیں!'' اور پھر سامنے بیٹھی عورت کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ میری ماں ہے اور اس کی گود میں میرا بچہ سنجے ہے۔''

تو اس کی شادی ہو چکی ہے۔ میرے لئے ایک غیر متوقع سی بات تھی۔ ایک معصوم اور حسین بچے کی ماں۔ وہ مُشکل سے ایک سال کا تھا۔ بڑی بڑی معصوم آنکھیں، چھوٹے چھوٹے سُنہرے بال، کُشادہ پیشانی اور پتلے پتلے نرم ہونٹ!

وہ پھر خاموش ہو گئی اور عجیب سی نظروں سے اپنے بچے کو گھورنے لگی۔ میں نے چاہا وہ اپنی بات جاری رکھے لیکن اُس کی وحشت زدہ اور پریشان آنکھوں کی طرف دیکھ کر مجھے کچھ کہنے کی بالکل ہمت نہ ہوئی۔ میں نے خیالات کا رُخ بدل دیا اور ڈبے میں دوسری عورتوں کا جائزہ لینے لگی۔

''اری بہن! یہ سب اس سرکار کا قصور ہے۔'' ایک صحت مند پنجابن اپنا بھاشن دے رہی تھی۔

مجھے بے ساختہ ہنسی آئی۔

سیمؔا نے میری طرف دیکھا۔ مُسکرانے کی ایک ناکام کوشش کی۔ میرا دِل پھٹ سا گیا۔ یہ عورت کِتنی خوبصورت ہے، خوبصورت بچے کی ماں بھی ہے۔ پھر خاموش کیوں ہے؟ چُپ کیوں ہے؟ اُداس کیوں ہے؟ میں نے نظریں اُٹھا کر اُس کی ماں کی طرف

دیکھا۔ وہ بھی خاموش تھی اور اپنی پوتے سے کھیل رہی تھی۔

آخر میں نے پوچھ ہی لیا: ''آپ کہاں جا رہی ہیں؟''

''کشمیر!''

میرا جذبۂ شوق اچانک جاگ اُٹھا۔

''مجھے یہ سُن کر خوشی ہوئی۔ میں بھی کشمیر کی رہنے والی ہوں۔''

''اوہ!'' اُس نے ہلکے سے اپنے ہونٹوں کو جنبش دی لیکن مُسکراہٹ کا کہیں نام نہ تھا۔

''میں ڈاکٹر ہوں۔ کشمیر میں میرے باپ کے ہوٹل ہیں۔ میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں!''

''شکریہ!''

اتنا مختصر سا جواب! میں نے پھر پوچھا۔

''آپ کے پتی کہاں ہیں؟''

وہ مجھے دیکھتی رہی۔ اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی لیکن دوسرے لمحے ختم ہوگئی۔ ایک نامعلوم سی پریشانی اور اُداسی نے اُس کے چہرے کو چھُپا لیا اور اُس کا سارا چہرہ یکدم پیلا پڑ گیا۔

''وہ ہمیشہ میرے ساتھ ہی رہتے ہیں''

اُس کی یہ بات میری سمجھ میں ذرا بھی نہ آئی۔

میں نے پھر پُوچھا: ''وہ کیا کام کرتے ہیں؟''

''ایئر فورس میں پائلٹ تھے۔'' اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''اُس نے مجھے ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔ شادی ہوئی، بچے پیدا ہوا اور اُس کی پیدائش کے صرف دو دِن بعد کشمیر سے لداخ جاتے ہوئے اُس کا جہاز نہ جانے کِن گھاٹیوں میں گُم ہو گیا۔''

''ظالم!'' میرے مُنہ سے اچانک نِکل گیا۔

''ہاں وہ ظالم تھا، خوبصورت تھا نا۔ اس لئے۔ میں اُسے پیار کرتی تھی نا اُس

لئے۔ وہ میرا دیوتا تھا، سب کچھ تھا۔ میرا پیار، میرا سنجے!''

اب اُس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مُسکراہٹ پھیل گئی۔ لیکن مجھے محسوس ہوا جیسے اس مُسکراہٹ تلے ایک طوفان چھُپا ہو۔

پھر وہ اچانک ہسٹریائی انداز میں بولی: ''بچہ پیدا ہونے کے صرف دو دِن بعد، سُنتی ہو بہن! صرف دو ہی دن بعد اُس کا جہاز آکاش کی بلندیوں میں پرواز کرتے کرتے دھرتی کی گھاٹیوں میں کھو گیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مُجھ سے جُدا۔''

میرے جسم سے ٹھنڈے پسینے چھوٹنے لگے۔ میرا سر چکرانے لگا۔ اُس کے رنج والم کو محسوس کر کے میرے دِل میں ایک کرب اور بے چینی سی پیدا ہوگئی۔ غم واندوہ سے میرے جذبات بھر آئے۔ اُف! اتنا بڑا حادثہ!!

''وہ رات بھی آج کی رات کی طرح سیاہ اور خوفناک تھی۔ اُس رات کا ہر نقش میرے جسم کے ہر حصے پر موجود ہے۔''

اچانک ٹرین رُک گئی۔ انبالہ اسٹیشن آ گیا تھا۔ ہمارے ڈبے میں تقریباً ہر مسافر سو گیا تھا۔ سیما کی ماں اور بچہ بھی اپنی نانی سے چمٹ چمٹ کر سو گیا تھا۔ نئے مسافروں کا نیا ریلا آیا۔ ہمارے ڈبے میں دو نئی موٹی سی عورتیں چند بھرے ہوئے ٹرنک لے کر آ گئیں۔

''بھئی اتنا سامان اُوپر مت رکھو، گر جائے گا۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''سُنتی ہو کانتا'' اُس نے دوسری عورت سے کہا۔ ''جیسے ہم نے کبھی ریل میں سفر نہیں کیا ہے۔ یہ چھوکری دیکھو مجھے سمجھا رہی ہے''۔

میں نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔ اُس کی گود میں کوئی دو سال کا بچہ تھا۔ وہ میرے قریب بیٹھ گئی۔ اُس کی ساتھی عورت اُس کے سامنے بیٹھ گئی اور میرے لئے سانس لینا بھی دُشوار ہو گیا۔ چند منٹوں کے بعد گاڑی پھر چل پڑی۔

میں نے بات کا رُخ بدل دیا۔ ''کشمیر کتنی دیر ٹھہرنا ہے؟'' میں نے سیما سے پوچھا۔

''اب تو ہمیشہ کے لئے رہنا ہے شاید۔ کلکتہ میں اب میں رہ نہیں سکتی۔ کلکتہ کی ہر چیز مجھے ان کی یاد دلاتی ہے۔ ہر بات اُن کے پاس لے جاتی ہے۔ ہر بات، ہر چیز۔ میں اب وہاں رہ نہیں سکتی اور کشمیر میں اس لئے کہ مجھے وہ اب بھی اُن گھاٹیوں میں تلاش کر رہے ہوں گے۔''

وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہوگئی۔ پھر خود ہی کہا۔

''میری ویران زندگی میں رکھا ہی کیا ہے۔ ایک بُوڑھی ماں ہے۔ ایک سنجے ہے۔ سنجے تو بالکل اُن کی صورت پر گیا ہے۔ سنجے اب میری رُوح ہے۔ میری جان ہے، میری زندگی ہے۔ اب سنجے کے لئے ہی تو میں جی رہی ہوں۔ ایک سنجے ہی تو ہے جس میں مجھے اُن کی رُوح نظر آتی ہے۔''

میں نے سنجے کی طرف دیکھا۔ خوبصورت پیارا بچہ۔ شاید شور سے جاگ گیا تھا اور اپنی آنکھیں کھول کھول کر دیکھ رہا تھا اور پھر بے ساختہ رونے لگا۔

''بچے کو دُودھ دو نا!'' میں نے سیما سے کہا۔

''نہیں، ابھی نہیں۔ میں بے وقت دُودھ پلا کر اس کی عادتیں بگاڑنا نہیں چاہتی۔''

سیما کی ماں بھی جاگ گئی تھی اور اب آہستہ آہستہ مجھے نیند آنے لگی تھی۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے زبردست زلزلہ آ گیا ہو! ایک زبردست آواز آئی اور ساتھ ہی کہرام سا مچ گیا۔ میری آنکھیں پتھرا گئیں۔ سارا ڈبہ خون سے بھرا پڑا تھا۔ مجھے پتہ چلا کہ انبالے والی عورت کا ایک ٹرنک نیچے گر گیا ہے اور...... اُس کے نیچے سیما کا بچہ کچل کر رہ گیا۔ صرف ایک ننھی سی، معصوم سی چیخ گونجی اور ہمیشہ کے لئے فضاؤں میں گُم ہوگئی۔

میں نے سیما کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں بھی جیسے پتھرا گئیں۔ اُن میں معمولی جنبش بھی نہ ہو رہی تھی۔ بس وہ پتھر کی مورتی کی طرح ایک ہی سمت دیکھے جا رہی تھی۔

سنجے!

''کہیں یہ صدمے سے مر نہ جائے!'' میں نے من ہی من میں سوچا۔

''کہیں یہ پاگل نہ ہو جائے!'' میرے ذہن میں ایک خیال اُبھرا۔

میں نے اپنے آنسوؤں کو قابو میں رکھا اور سیما کو جھنجھوڑا۔ اُس نے اپنی آنکھوں کے دیدے گھمائے لیکن وہ اب بھی خاموش تھی۔ بے ساختہ میرا ہاتھ زنجیر کی طرف بڑھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں زنجیر کھینچتی، کسی نے میرا ہاتھ روک دیا۔

یہ سیما کے سوا کوئی نہ تھا۔

وہ لمحہ...... جب ایک پھول کمرے کے فرش پر کچل کر رہ گیا تھا اور ماں کی آنکھیں ایک آنسو بھی بہا نہ سکیں اور ہونٹ ایک آہ بھی نہ کر سکے...... گزر گیا تھا۔ میرے ہاتھ زنجیر تک پہنچ کر رُک گئے تھے۔ لیکن مجھے چند عورتوں کی چیخوں نے چونکا دیا۔

''ارے زنجیر کھینچو۔ یہ کیا تماشا ہے!''

بچہ ختم ہو گیا۔ چند عورتیں بچے کے چاروں طرف جھکی ہوئی تھیں۔ اُنہوں نے ٹرنک کو گھسیٹ کر ایک طرف ہٹا دیا تھا۔ سیما کی ماں نے دونوں ہاتھوں سے کچلے ہوئے پھول کو اُٹھا کر اپنے سینے سے چمٹا لیا۔

''میرا بیٹا سنجے!...... میرا سنجے......!!''

پھول کی پتیاں بکھر گئی تھیں اور خوشبو مفقود۔ ڈبے میں دبی دبی سسکیوں کی آواز اور چند آنسو تھے جو ہر ماں کی آنکھ میں بھرے تھے۔ ہر نگاہ سنجے پر تھی۔ انبالے والی عورت بھی سب کے ساتھ اُسی کی طرف متوجہ تھی۔ اُس کی زبان جیسے کسی زنگ آلود دروازے کی طرح بند ہوئی تھی۔ اُس کا اپنا بچہ سیٹ پر لیٹا تھا۔

میں نے اچانک سیما کو دیکھا۔ وہ سیٹ پر لیٹے ہوئے بچے کو عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اُن آنکھوں سے، چنگاریاں نکلتی ہوئی محسوس کیں۔ مجھے محسوس ہوا جیسے اگلے لمحے اُس کے ہاتھ اس بچے کو اُٹھا کر باہر اُچھال دیں گے۔ نہ جانے کیوں میں نے بے ساختہ اُس کی کلائیوں کو مضبوطی سے تھام لیا۔

گاڑی چلتی رہی۔ ہونٹ خاموش ہو گئے۔ نظریں مایوس ہو گئیں۔ لیکن مجھے کیا پتہ تھا کہ آنے والا لمحہ اس سے زیادہ بھیانک، اس سے بھی زیادہ خوف ناک ہوگا۔ ہماری زندگی بھی تو لمحات ہی پر مبنی ہے۔ اگر ہم آنے والے لمحات کے بارے میں پہلے سے جان سکیں تو ہم اپنی دُنیا بدل سکتے ہیں اور...... دوسرے لمحہ گاڑی کسی زوردار چیز سے ٹکرا گئی۔ اُس کے بعد مجھے کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔ جب ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ گاڑی کسی حادثہ کا شکار ہوگئی ہے۔ سارا سامان ادھر اُدھر بکھرا پڑا ہے۔ لوگ مدد کے لئے چلا رہے ہیں۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اُسی وقت سیما کی ایک دردناک چیخ میرے کانوں سے ٹکرائی اور مجھے محسوس ہوا جیسے جہاز ایک بار پھر لداخ کی گھاٹیوں میں گُم ہو گیا ہو۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا اُس پر جنون کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ اُس کی آنکھیں کھُل کر باہر کو نکل آئی تھیں اور اُس کی بانہوں میں انبالہ والی عورت کا بچہ ڈول رہا تھا اور وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی...... "دیکھو سنجے کی ماں، دیکھو میں نے سنجے کو کیسے بچالیا۔ میرا سنجے! میری جان!" وہ اُسے دیوانہ وار چومنے لگی۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا۔ میں نے آنسوؤں کو روکنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے دوسری طرف مُنہ پھیر لیا۔

کشمیر پہنچ کر بھی میں سیما کو نہ بھول سکی۔ میں نے اُسے بہت تلاش کیا، آج بھی تلاش کر رہی ہوں۔ لیکن اُس کا کوئی پتہ نہیں۔ نہ جانے وہ اب کہاں ہے؟ کس حال میں ہے۔ بات ایک سفر کی ہوتی، ایک منزل کی ہوتی تو کوئی بڑی بات نہ تھی۔ بات زندگیوں کی تھی، ماں کی ممتا کی تھی اور......اور......!!



درندے

جب شام کے لانبے لانبے سرمئی سائے زمین پر پھیلتے ہیں اور پھیل کر سمٹتے ہیں تو دھیرے دھیرے ہولے ہولے رات جاگتی ہے اور جب رات جاگتی ہے تو میرے دل کا ہر درد جاگ پڑتا ہے، کاش دنیا میں صرف اُجالے کی دھوپ ہوتی، اندھیروں کی برکھا نہ ہوتی۔ مجھے یاد ہیں زندگی کے وہ یادگار دن جب میں کسی خوش رنگ اور خوشنما پرندے کی مانند اُوپر، بہت اُوپر نیلے آسمان کی وسعتوں میں محوِ پرواز تھا، اچانک وقت کے بہاؤ نے میرے پر کتر لئے اور میں فضاؤں میں ڈولتا ہوا، گرتا ہوا زمین پر آگرا۔ میرے سارے خواب بکھر گئے اور بکھر کر ٹوٹ گئے۔ میری ساری سوچیں کہرے کی موٹی چادر سے ڈھک گئیں، وہ سارے راستے جن پر میرے قدموں کے نشان پیوست ہو چکے تھے دُھندلا گئے...... میری منزل گم ہو چکی تھی!

ذرا ٹھہریئے آپ شاید میری پوری بات سننا چاہتے ہیں، وہ ایک خوشگوار شام تھی، شام جو بن سنور کر، سج دھج کر زمین پر اُتر آئی تھی، وہ لمحہ' وہ ایک لمحہ آج بھی میرے ذہن میں تر و تازہ ہے، ایک کھلتے ہوئے گلاب کے پھول کی طرح، جب کلی کلی کے ہونٹوں پر صرف اُس کے حُسن کا چرچا تھا، جب ہم دونوں نے مل کر دل کے تاریک گھر میں پیار کی ایک جوت جلائی اور فیصلہ کیا کہ آندھی اور طوفان سے بچا کر ہم اپنے پیار کے ننھے سے لرزتے سے دیئے کو فروزاں رکھنے کی کوشش کریں گے اُسی ایک لمحے میں کائنات کی نبض رک سی گئی، ہم دونوں نے آگے بڑھ کر محبت کے اقرار نامے پر اپنی مہریں ثبت کر دیں!

''کتنا چاہتی ہو مجھے''

''بتانا ضروری ہے کیا''

''ہاں''

''اتنا چاہتی ہوں کہ میں تمہاری ایک چھوٹی سی آرزو کے لئے اپنا تن من نچھاور کر سکتی ہوں، تمہارے ایک اشارے پر صحرا صحرا ریت چھان سکتی ہوں، ساگر کی گہرائیاں ناپ سکتی ہوں''۔

''بس کرو بس''

''اب میں بھی تم سے سوال کروں''

''ہاں''

''بتانا ضروری ہوگا''

''ہاں''

''تو سنو تمہارے لئے آگ کے دریا کو پار کر سکتا ہوں، اونچے پہاڑوں کی چوٹیاں سر کر سکتا ہوں''۔

''بس بس، اب زیادہ شاعری نہیں''

''شاعری نہیں حقیقت بیان کر رہا ہوں، میری ہر سوچ، میری ہر ڈگر بس اب تم سے ہی آباد ہے''۔

اور وقت کا پہیہ تیزی سے گھومتا رہا، ہم دونوں محبت کی ناؤ میں بہت دور نکل گئے کل تک جینا ایک خواب تھا اور اب زندگی رشک کر رہی تھی، ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پالیا تھا، جھرنوں کے سنگیت میں، پھولوں کی خوشبو میں' پرندوں کی چہکار میں...... اس طرح ہم دونوں یونیورسٹی کی تعلیم سے فارغ ہو گئے۔ میں دو سال کے لئے لندن چلا گیا جہاں مجھے ایک جاب ملا تھا، مادوی اپنے ہی شہر میں ایک کالج میں لیکچرر بن گئی لیکن دور ہو کر بھی ہم ایک دوسرے کے قریب رہے ایک دوسرے کا انتظار کرتے رہے، ہم دونوں ایک دوسرے سے دور ہو کر بھی ایک ہی خواب دیکھتے رہے، ایک گھر کا خواب، گھر بسانے کا سپنا، ایک ہنستا کھیلتا گھر جس کے آنگن میں پھولوں کی چھوٹی چھوٹی کیاریاں ہوں جس کے برآمدے میں دو ننھے ننھے خوبصورت بچے ہنستے کھیلتے نظر آتے ہوں!

لیکن زندگی کس موڑ پر لے آئی ہے مجھے!

جس روز میں لندن سے اپنے شہر لوٹنے والا تھا میں نے اپنے آنے کی اطلاع صرف مادوی کو دی اور مادوی نے مجھے فون پر بات کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ آج میں کس قدر خوش ہوں، جی کرتا ہے کہ آسمان کے تارے نوچ لوں اور تمہارے قدموں پر ڈال دوں، میں تمہیں خود لینے آؤں گی، ایر پورٹ پر تمہارا انتظار کروں گی۔''

اور جب میں ایر پورٹ پہنچا تو کسی کو بھی اپنا منتظر نہیں پایا، مادوی کو بھی نہیں۔ میرا دل ٹوٹ گیا، میری آنکھوں کے کونے بے ساختہ بھیگ گئے۔ ایک ہوک سی اٹھی، میرا سارا وجود جیسے دھواں دھواں ہو گیا اور میں ٹوٹتے ہوئے قدموں سے ایر پورٹ سے باہر آیا، سیدھا مادوی کے گھر گیا میں یہ جان کر حیران رہ گیا کہ مادوی تو صبح سویرے ہی ایر پورٹ جانے کے لئے گھر سے نکلی تھی مجھ سے ملنے کے لئے۔ پہلے ہم نے مادوی کے دوستوں کو فون کئے اور اس کے بعد مادوی کے کالج جا کر پوچھ تاچھ کی لیکن ہر جانب جیسے خاموشی کے اندھیروں نے حصار کھینچ لئے تھے جیسے سب نے چپ رہنے کی قسم کھائی تھی۔ اور پھر ہم نے مادوی کی گمشدگی کی اطلاع پولیس تک پہنچا دی!

اور اب میں کیسے بتاؤں، مادوی ہاسپٹل کے ایک خاموش کمرے میں زندگی اور موت کے دوراہے پر کھڑی بار بار میرا نام لے رہی تھی۔

''میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا، میں تمہیں موت کے بے رحم ہاتھوں سے چھین لوں گا تم جیو گی میرے لئے اپنے ہونے والے بچوں کے لئے ان خوابوں میں رنگ بھرنے کے لئے جو ہم نے ایک ساتھ دیکھے تھے!''

لیکن مادوی نے میرا انتظار نہیں کیا، میری بات تک بھی نہ سنی، جب میں نے ہاسپٹل کے کمرے میں قدم رکھا تو مادوی میرا نام لیتے لیتے سو چکی تھی، ہمیشہ کے لئے اور پولیس مرنے سے پہلے اس کا بیان بھی لے چکی تھی اور اب وہ ان درندوں کی تلاش کر رہی تھی جنہوں نے مادوی کو ایر پورٹ جاتے ہوئے اغوا کر لیا تھا اور اُس کی آبروریزی کر کے لہولہان کیا تھا اور پھر اُسے زخمی اور برہنہ حالت میں بجھی بجھی سی سانسوں کے ساتھ شہر سے دور ایک ویران سڑک پر پھینک دیا تھا!!!

لکیر

تیس سال کی لمبی مسافت طے کرنے کے بعد لوٹ آیا ہوں اپنی بستی میں، اپنے لوگوں میں، اپنے گھر میں...... تیس سال قبل جب میں نے آر پار کی لکیر پر اپنے قدموں کے نشان چھوڑے تھے تب میں پچیس برس کا ایک خوبرو جوان تھا جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں کھلتی رہتی تھیں، آنکھوں میں خوابوں کی روشنی جھلملاتی رہتی تھی۔ چہرے پر گل لالہ کی رنگت بکھری رہتی تھی یوں کہئے کہ زندگی کا لمحہ لمحہ تابناک تھا اب میں پانچ برس قبل پچاس سال کی لکیر پار کر چکا ہوں، لیکن اب نہ تو ہونٹوں پر مسکراہٹیں کھلتی ہیں اور نہ ہی آنکھوں میں خوابوں کی روشنی دکھائی دیتی ہے۔ چہرے پر گل لالہ کی رنگت بھی نظر نہیں آتی، اب تو میرے اِن آنکھوں میں ویرانیاں ہیں، چہرے پر سنجیدگی کی ان گنت لکیریں ہیں۔ میں جب تیس برس قبل اِس پار سے اُس پار گیا تھا تب ایک اَن جانا اَن دیکھا جنوں میری سوچوں پر حاوی ہو چکا تھا میرا یہ جنوں ایک طویل سلسلے کی ایک مختصر سی کڑی تھی، اسی طویل سلسلے کے پس منظر میں، پہلے میں بے شمار لوگوں کو دیکھتا رہا، جانے اتنے بے شمار لوگ کہاں سے اور کیسے سڑکوں پر اُمڈ آتے تھے، اُن کی گونجتی آوازوں کو سنتا رہا، جانے اِن آوازوں میں یہ کیسی کشش تھی کہ ہونٹ خود بخود ساتھ دینے لگتے۔ یہ سارے لوگ کچھ مانگتے تھے، شاید اپنی مرضی سے جینے کا حق، اس حق کو حاصل کرنے کی خواہش میرے دل کے پوشیدہ گوشوں میں بھی اُبھرنے لگی اس حق کی تلاش میں اُن سب کے قدموں کے ساتھ میں بھی اپنے قدم ملانے لگا اُن میں سے ایک ہونے کی کوشش کرنے لگا اُن کی گونجتی آوازوں کے ساتھ اپنی مدھم سی آواز بھی ملانے لگا۔ اُن نشستوں میں بیٹھنے لگا جہاں منصوبے ترتیب پاتے

تھے، پروگرام تشکیل دیئے جاتے تھے اور پھر میں نوجوانوں کی ایک ایسی ٹولی میں شامل ہو گیا۔ جنہوں نے اپنے ہاتھوں میں بندوقیں تھام رکھیں تھیں، اُن کے ساتھ میں بھی بستی بستی گھومتا رہا، آوازیں بلند کرتا رہا، قیدی بن کر قید خانوں کو آباد کرتا رہا۔ لیکن جب کچھ بھی حاصل نہ ہوا، کچھ بھی نہ پا سکا تو ایک دن اپنی بستی کو پُر درد انداز سے الوداع کہا اور لکیر کو پار کر کے ادھر سے اُدھر گیا تا کہ زندگی کے ادھورے خواب پورے ہوں اور زندگی کو نئی رفتار کے ساتھ نئی سمت مل جائے لیکن لکیر کے اُس پار کی بستی ہر لحاظ سے میری ہی بستی کی ایک تصویر تھی، لوگ بھی ہم جیسے، تہذیب و تمدن بھی ہم جیسا، بول چال بھی ہم جیسی، جینے مرنے کا انداز بھی اپنا سا، یہاں تک کہ گھر اور گھر کے در و دیوار بھی ایک جیسے، دن ایک جیسا، رات ایک جیسی، موسم ایک جیسے، ہریالی ایک جیسی، پیڑ پودے اور پھول ایک جیسے، سب کچھ ایک جیسا، یکساں یکساں سا، یہاں تک کہ شکل و صورتیں اور خدوخال بھی ایک جیسے، یہ سب کچھ دیکھ کر میں حیران ہوا، بہت حیران، حیران اس لئے بھی ہوا کہ یہاں بھی لوگ اپنے حق کی تلاش میں اپنی مرضی سے جینے کے حق کو پانے کی خواہش میں سڑکوں پر نظر آتے تھے، اپنی گونجتی آوازوں سے پوری بستی کو ہلا کر رکھ دیتے تھے، میں بھی اُن میں شامل ہو گیا، اُن کے قدموں میں میرے قدموں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں، اُن ہی کی طرح میں بھی قیدی بن کر قید خانوں کو آباد کرتا ہوں اور پھر اُن محفلوں میں شرکت کرنے لگا جہاں منصوبوں اور پروگراموں کو عملی روپ دیا جاتا تھا، میں نے ایک بار پھر ہاتھوں میں بندوق تھام لی۔ لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا، آر پار سب کچھ ایک جیسا دیکھ کر خاموشی کے اندھیاروں میں گم ہو گیا اور اُوندھے منہ زمین پر آ گرا، سارے خواب گرد آلود ہو گئے اور جب میرا زخمی وجود ہوش میں آیا تو میں دور دور تک اپنے قدموں کے نشان ڈھونڈنے، نشان جو میرے اپنے قدموں کے نشان تھے وہ کہیں بھی نظر نہیں آئے۔ لیکن میری سوچیں میرے ساتھ تھیں، میں نے اپنے ذہن کے بے شمار گوشوں کو ٹٹولا، اُن میں جھانکا اور سوچتا رہا، اپنے بارے میں، اُن سب کے بارے میں جو اپنی مرضی سے جینا چاہتے تھے اسی لئے اپنے حق کے لئے لڑ رہے تھے، ادھر بھی اور ادھر بھی لکیر کے اُس پار بھی اور اِس پار بھی۔ اب میں تیس سال اُس پار رہنے کے

بعد اس پار لوٹ آیا ہوں، ان تیس برسوں کے دوران اُس پار کی طرح اس پار بھی کچھ نہیں بدلا ہے سب کچھ ویسا ہی ہے، سرحد کی لکیر بھی ویسی ہے جو اس پوری بستی کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے ایک تصویر کو دو روپ دیتی ہے۔ اگرچہ میری عمر کی لکیر آہستہ آہستہ سمٹتی جا رہی ہے لیکن میری بستی کو تقسیم کرنے والی لکیر اپنی جگہ پر برابر کھڑی ہے، قائم و دائم ہے، یہ لکیر مٹ جائے تو شاید......، بہت سوچا، بہت سوال کئے اپنے آپ سے...... میرے ہر سوال کا جواب شاید آر پار کی اسی لکیر میں پوشیدہ ہے۔ میری قسمت اچھی تھی کہ میں آتے جاتے وقت اس لکیر کو پار کر گیا ورنہ اس لکیر کی تہہ میں بے شمار، لاتعداد اور ان گنت بے نام قبروں میں سونے والے بے نام افراد کے بے نام کہانیاں بھی آپ کے لئے قلم بند کرتا!!



ساتھ ہے مہربان میرا

رات کافی جھک آئی تھی

ہر سمت تاریکی تھی، کبھی کبھار بجلی کوندتی تو پرانی سڑک کے دونوں طرف سپیدے کے لمبے لمبے درخت بھوت جیسے نظر آتے اور دور پہاڑی کے دامن میں نئی پرانی کوٹھیاں عجیب سی لگتی تھیں، ایسی ہی تاریکی میں وہ آہستہ آہستہ جارہی تھی۔ اس کی دھیمی دھیمی چال سے لگتا تھا جیسے وہ گہرے غم کی وادیوں میں گم ہو چکی ہو، بجلی کوندتی تو اس کی تیز چمک میں اُس کا سرخ وسپید گول گول چہرہ، گلاب کی پتیوں جیسے سُرخ سُرخ ہونٹ، بکھرے بکھرے بال اور بھرا بھرا جسم صاف صاف نظر آتے تھے۔ دفعتاً وہ ایک کوٹھی کے سامنے رک گئی اور پھر اور قریب جا کر گیٹ پر لگی نیم پلیٹ کی جانب دیکھا۔ کچھ دیر دیکھتی ہی رہی اور پھر دفعتاً اُس کے ہونٹوں پر مسکان اُبھر آئی۔

دوسرے ہی لمحے کال بیل کے بٹن کو دبا دیا، ایک لمحے کے لئے خاموشی کا سکوت ٹوٹا اور پھر وہی خاموشی، مسلسل اور بیکراں خاموشی، اندر سے کوئی آواز سنائی نہ دی، اُس کے ہونٹوں پر اُبھرتی مسکان جیسے گم ہوگی۔ چہرہ پھر غم کی وادیوں میں ڈوب گیا، اُس کی کنول جیسی آنکھیں پتھرا گئیں۔ لیکن اُس نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا اور دوبارہ کال بیل کا بٹن دبایا۔ دباتی ہی رہی!

''کس سے ملنا چاہتی ہیں آپ'' نوکر نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

اُس نے بڑی نرمی سے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب سے ملنا ہے''

''ڈاکٹر صاحب سے'' نوکر کے لہجے میں حیرانگی تھی۔

''جی ہاں ڈاکٹر صاحب سے''

''لیکن ڈاکٹر صاحب ابھی ابھی کوئی آپریشن کر کے آئے ہیں اور اب آرام کر رہے ہیں اور رات کے اِس وقت......!''

''لیکن وہ سخت بیمار ہیں' اِن پر بے ہوشی کا دورہ پڑا ہے اگر انہیں کچھ ہو گیا تو میری دنیا تاریک ہو جائیگی۔''

''لیکن''

''بھگوان کے لئے ڈاکٹر صاحب کو جگا دیجئے' میں بڑی سے بڑی فیس دینے کے لئے تیار ہوں۔''

''آپ اندر بیٹھے، میں ڈاکٹر صاحب سے بات کرنے کی کوشش کروں گا''

ایک عجیب سے انداز میں وہ ڈرائینگ روم میں بیٹھ گئی مگر اُس کی ہر حرکت، ہر ادا سے بے قراری کا اظہار ہو رہا تھا، باہر اب بارش شروع ہو چکی تھی۔

نوکر نے دروازہ بند کیا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

''تم نے مجھے کیوں Disturb کیا'' ڈاکٹر نے تیز لہجے میں کہا

''صاحب' ایک عورت آپ کا انتظار کر رہی ہے، اس کا پتی شاید بیمار ہے اور وہ۔!''

''اچھا تم چلو'' ڈاکٹر نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر جب اپنے ڈرائینگ روم میں داخل ہوا تو رات کے بھیانک تاریک لمحوں میں ایک خوبصورت اور جوان عورت کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''ڈاکٹر صاحب، اُن پر بے ہوشی کا دورہ پڑا ہے، آپ میرے ساتھ چلئے''۔

''وہ کون''

''میرے پتی، اگر انہیں کچھ ہو گیا تو میری دنیا لٹ جائے گی۔''

''لیکن''

''میں آپ کی فیس دینے کے لئے تیار ہوں، منہ مانگی فیس''

''فیس، میں فیس کی بات نہیں کرتا، میرا ڈرائیور چلا گیا ہے کار کون ڈرائیور کرے گا۔ بہر حال میں چلوں گا آپ کے ساتھ۔''

ڈاکٹر نے رین کوٹ کندھوں پر ڈال دیا اور اپنا بیگ اُٹھایا اور وہ دونوں گھر سے باہر آ گئے راستہ اب بھی تاریک تھا اور بارش نے شدت اختیار کرلی تھی۔ کچھ دور چل کر وہ ایک چھوٹی سی کوٹھی کے سامنے رک گئے، عورت نے گیٹ کھولا، ڈاکٹر قریب ہی تھا، اُس نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک ادھیڑ عمر کا آدمی بے ہوش پڑا تھا، ڈاکٹر نے بغیر کچھ کہے اُس کا معائینہ شروع کیا، خود وہ تھوڑے سے فاصلہ پر حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

''کیا یہ بہت زیادہ پیتے ہیں۔''

عورت نے اقرار میں گردن ہلادی۔

''میں انجکشن لگا دیتا ہوں، لیکن صبح تک یہاں ٹھہرنا پڑے گا، مجھے یقین ہے کہ اس انجکشن سے ان کی حالت سنبھل جائے گی''۔

عورت کمرے سے باہر چلی گئی۔

ڈاکٹر کو کب نیند آئی، وہ کب سویا، وہ بے خبر ہی رہا، دفعتاً مریض کے کراہنے کی آواز سُن کر وہ چونک پڑا۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا، مریض کی نبض دیکھی، اُس کی حالت آہستہ آہستہ بہتر ہو رہی تھی۔

''کوئی ہے'' وہ چیخا

دوسرے ہی لمحے وہ عورت آ گئی۔

''دیکھئے ان کی حالت بدل رہی ہے، یہ ہوش میں آ رہے ہیں، خطرہ ٹل چکا ہے۔''

''میں کیسے آپ کا شکریہ ادا کر دوں''

''اس میں شکریہ کی کون سی بات ہے، یہ تو میرا فرض تھا۔''

''اب کوئی خطرہ تو نہیں''

''نہیں'' ڈاکٹر نے یقین کے ساتھ کہا۔

''میں آپ کے لئے کافی بناتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

ڈاکٹر کی آنکھ لگ گئی۔ جب وہ جاگ پڑا تو دن بیدار ہو چکا تھا، اس کے کانوں سے مریض کی آواز ٹکرائی۔

''میں کہاں ہوں، مجھے کیا ہو گیا تھا۔''

''آپ آرام کیجئے، آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔''

''لیکن''

''آپ اپنے گھر میں ہیں، آپ پر مسلسل بے ہوشی کا دورہ پڑا تھا، آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ بچ گئے صرف اپنی بیوی کی وجہ سے آپ نے دوبارہ زندگی پائی۔''

''میری بیوی'' اُس نے حیرانی سے پوچھا۔

''جی ہاں'' آپ کی بیوی، مجھے رات کو یہاں لے آئی آپ کو دیکھنے کے لئے، آپ کی زندگی بچانے کے لئے۔''

''میری بیوی''

''جی ہاں آپ کی بیوی۔ وہ دیکھئے'' ڈاکٹر نے سامنے دیوار پر لٹکی ہوئی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ آپ کی بیوی ہے نا''

''ہاں..........نہیں نہیں، یہ نہیں ہو سکتا'' یہ کیسے ہو سکتا ہے'' وہ چیخ پڑا۔

''کیوں.........کیوں نہیں ہو سکتا''۔

''یہ ہو ہی نہیں سکتا ڈاکٹر، اُسے مرے ہوئے پانچ سال ہو چکے ہیں۔''



روشنی اور سائے

سنگر مال شاپنگ کمپلکس کی دوسری منزل میں قدم رکھتے ہی میرا یقین بے یقینی میں بدلنے لگا، میری آنکھیں پتھرا گئیں جیسے وہ بے نور ہو چکی ہوں آنکھوں کی روشنی سے محروم ہو چکی ہوں۔ شاپنگ کمپلکس کی ساری روشنیاں جیسے بجھ کر اندھیروں میں ڈوب چکی ہوں۔ لیکن یہ میرا وہم ہے، میری بے یقینی ہے، شاپنگ کمپلکس کی ساری روشنیاں جگمگا رہی ہیں اور ہر طرف روشنی بکھیر رہی ہیں۔ میں عالیہ کو بخوبی دیکھ سکتی ہوں، چہرے پر ایک نئی شادابی اور تازگی کے ساتھ جیسے اس نے بہت سارے گلاب کے پھولوں کو نچوڑ نچوڑ کر ان کے عرق سے اپنے چہرے کو سیراب کیا ہو اور آنکھوں میں نئے نئے اور حسین حسین خواب سجائے ہوں، عالیہ کو پہچاننے میں مجھے ذرا بھر بھی دیر نہ لگی۔ میں اُسے اس نئے رنگ و روپ میں بھی پہچان چکی ہوں، اُس نے ایک بہت ہی خوبصورت قیمتی سوٹ پہن رکھا ہے، کانوں میں چاندی کے سپید سپید آوازے لٹک رہے ہیں۔ دائیں ہاتھ کی ایک انگلی میں سونے کی انگوٹھی چمک رہی ہے، اب سے قریب قریب دو برس قبل عالیہ میری ملازمہ تھی، میری نہیں ہماری ملازمہ تھی۔ میں نے خود ہی اُسے گھر سے بے گھر کر دیا تھا حالانکہ میں اس پر بے حد اعتبار کرتی تھی، اس قدر اعتماد اور بھروسہ کہ سارا گھر کھلا چھوڑ کر اسکول جاتی تھی، کھلے دروازے، کھلی کھڑکیاں، وارڈ روب اور الماریوں کے دروازے تک کھلا چھوڑ جاتی تھی، میرے قیمتی سے قیمتی ملبوسات، میرے زیورات، میرا سونا چاندی، سب کچھ اس کی نظروں کے سامنے رہتا تھا۔ کبھی کوئی چیز گم نہ ہوئی، جہاں چھوڑ جاتی وہیں مل جاتی ......تو پھر میں نے اُسے گھر سے بے گھر کیوں کر دیا۔؟!

دیکھیے میں خانم ہوں، شہر کے ایک بڑے اور مصروف ترین بزنس مین احمد کلیم کی بیگم...... میرے میاں اپنے بزنس میں اس قدر مصروف و مشغول رہتے ہیں کہ نہ تو اُنھیں اپنی گھریلو زندگی کا احساس ہے اور نہ ہی گھر گرہستی کی فکر۔ اب ہمیں شادی کیے سات سال کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن ہم آج بھی اولاد کی نعمت سے محروم ہیں۔ ہمارے گھر میں ہر وقت خاموشی چھائی رہتی ہے، ایک طویل اور نہ ٹوٹنے والی خاموشی، یہ خاموشی کبھی کبھار اُس وقت ٹوٹ جاتی ہے جب میرے میاں تفریح کے موڈ میں ہوتے ہیں اور تفریح کے یہ لمحے اُن کی مصروفیات کی وجہ سے ہماری زندگی میں بہت کم آتے ہیں، گھر کی اس خاموشی سے دور رہنے کے لیے میں اپنا وقت شہر کے ایک مشنری اسکول میں گزارتی ہوں اور بغیر کسی معاوضہ کے پڑھنے پڑھانے میں اپنے آپ کو مشغول رکھتی ہوں۔ میں نے گھر کی ساری ذمہ داریاں عالیہ کے کندھوں پر ڈال رکھی تھی، گھر کی صفائی سے لے کر کھانا بنانے کی ذمہ داری وہ بخوبی نبھاتی تھی لیکن ایک روز ایسا ہوا میں اسکول سے جلدی گھر چلی آئی شاید میرے سر میں درد ہو رہا تھا اور میڈم نے آرام کرنے کی رائے دی۔ میں جب گھر کے آنگن کا دروازہ کھول ہی رہی تھی تو میں نے اپنے میاں کو گھر کے دوسرے دروازے سے باہر جاتے ہوئے دیکھا۔ بے وقت گھر آنے کا اُن کا یہ رویہ مجھے عجیب سا لگا اور پھر مین گیٹ سے باہر آنے کے بجائے دوسرے دروازے سے باہر جانا بھی میرے لیے ایک نئی بات تھی، یہ دروازہ ہم میاں بیوی بہت ہی کم استعمال کرتے تھے۔ یہ دروازہ قریب قریب بند ہی رہتا تھا۔ میں خاموش قدموں سے گھر کے اندر چلی آئی اور میں جو کچھ نے دیکھا وہ میرے لیے حیران کن ہی نہیں پریشان کن بھی تھا، میں نے ایسا کبھی سوچا تک نہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ عالیہ نے میرا ایک بہت ہی قیمتی اور من پسند سوٹ پہن رکھا ہے اور اس کا بوسیدہ لباس فرش پر پڑا ہوا ہے۔!

میں نے اُسی وقت عالیہ کو اپنے گھر سے گھر کر دیا!

میرے میاں نے عالیہ کے جانے کے بارے میں کوئی بات نہیں کی، مجھ سے کوئی وضاحت طلب نہیں کی۔ ہاں میں نے یہ ضرور کہا کہ میں نے عالیہ کی چوری پکڑی اور

اُسے نوکری سے نکال دیا ہے۔

''کیسی چوری؟'' انھوں نے ناسمجھ بنتے ہوئے کہا۔

''اُس نے میری سونے کی انگوٹھی چرالی تھی اس لیے میں نے اُسے نہ رکھنے کا فیصلہ کرلیا۔'' میں نے کہانی کا رُخ بدلتے ہوئے کہا۔

بات آئی اور ختم ہوگئی۔ عالیہ ہمارے ذہنوں سے اُتر گئی۔ ہمارے گھر کی خاموشیوں میں اُس کا نام ہمیشہ کے لیے گم ہوگیا۔ میں نے اسکول نہ جانے کا فیصلہ کرلیا اور اپنے آپ کو گھر کی خاموشیوں کی نذر کردیا......!

اور آج وہی عالیہ میری نظروں کے سامنے سنگر مال شاپنگ کمپلکس کے ایک فیشن شاپ میں قیمتی ملبوسات خریدنے میں مصروف ہے، بہت ساری چیزیں وہ پہلے ہی خرید چکی ہے، وہ بھی مجھے دیکھ چکی ہے اور شاید پہچان بھی چکی ہے۔ میں وہاں سے چلی آتی ہوں اور شاپنگ کمپلکس کی پہلی منزل پر آکر اُس جگہ رک جاتی ہوں جہاں سے میں بہت نزدیک سے عالیہ کو دیکھ سکتی ہوں۔ کچھ ہی دیر بعد وہ نیچے آئی اور مجھے دیکھ کر رک گئی۔ ملبوسات سے بھرا ایک بڑا سا بیگ فیشن شاپ کے ملازم کے ہاتھوں میں ہے، اس نے پرس سے چابی نکالی اور ملازم سے کہا:

''تم یہ سارا سامان میری گاڑی میں رکھ لو اور میرا انتظار کرو، میں ابھی آجاتی ہوں گی۔''

ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا جاتی ہے۔

''کہیے بیگم صاحبہ کیسی ہیں آپ؟''

''میں تو ٹھیک ہوں عالیہ! لیکن تمھیں یہاں دیکھ کر حیران ہو رہی ہوں''۔

''حیران کیوں ہو رہی ہیں آپ، کیا مجھے یہاں آنے کا کوئی حق نہیں، قیمتی ملبوسات، کپڑے، زیورات اور چھوٹی بڑی چیزیں خریدنے کا کوئی حق نہیں۔''

''نہیں، میں حق کی بات نہیں کر رہی ہوں۔ یہ شان، یہ مان، یہ خریداری، ان کے لیے ڈھیر سارے روپیوں کی ضرورت پڑتی ہے اور کیا......؟''

''یہ سب کچھ تو میرے پاس ہے، شان بھی، مان بھی، روپیہ پیسہ بھی...... گھر اور گاڑی بھی...... کام کرنے کے لیے گھر میں نوکر بھی...... ایک نہیں تین تین نوکر......'' اُس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''لیکن یہ سب کچھ کیسے آ گیا تمھارے پاس...... چوری...... ڈاکہ......!''

''وہ بھی جاننا چاہتی ہیں آپ؟''

''ہاں ہاں ضرور''۔

''تو یوں سمجھ لیجیے کہ میں نے ایک ڈاکہ ڈالا ہے۔''

''کہاں، کب، کس کے ہاں؟''

''یوں سمجھ لیجیے کہ آپ ہی کے ہاں...... یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں آپ کے گھر میں رہا کرتی تھی۔

''میرے ہاں، لیکن میرے ہاں تو کوئی چوری نہیں ہوئی۔''

''ہاں ہوئی ہے لیکن آپ بے خبر ہیں۔ حالانکہ میں بتانا نہیں چاہتی تھی اور انھوں نے منع کر رکھا ہے''۔

''کس نے؟''

''میرے شوہر نے''۔

''تم نے شادی کر لی...... کب؟''

''قریب قریب دو برس قبل...... جب آپ نے مجھے اپنے گھر سے بے گھر کر دیا تھا۔''

''کس سے شادی کی تم نے؟''

''میڈم خانم...... آپ نہیں جانتی کیا...... میں آپ کے شوہر کی دوسری بیوی ہوں۔''

ان جگمگاتی روشنیوں میں مجھے ایک بار پھر اندھیرا نظر آنے لگا ہے اور اس اندھیرے میں ایک دھندلا دھندلا سا نقش میری آنکھوں کے سامنے اُبھر رہا ہے......

میرے شوہر اور مصروف ترین بزنس میں کلیم احمد کے روپ میں، لیکن یہ نقش خود بخود مٹتا چلا جا رہا ہے، نظروں سے دور ہوتا جا رہا ہے۔

یہ خلش اگر نہ ہوتی

لڑائی مختصر لیکن فیصلہ کن تھی!

یہ اُن دنوں کی پہلی سنجیدہ لڑائی تھی۔ عارف اس لڑائی سے حیران تو ضرور ہوا لیکن اپنی ہٹ دھری سے باز نہ آیا۔ اس نے اپنی بیوی سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ کسی بھی صورت میں اس کے رشتہ داروں کو بار بار دعوت پر بلا نہیں سکتا۔ اس کا مطلب یہ تو نہ تھا کہ وہ اپنی بیوی کے رشتہ داروں کو پسند نہیں کرتا۔ بلکہ معاملہ اس کے برعکس تھا۔ وہ اسے اچھے لگتے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اب ہر دوسرے تیسرے روزان کی آمد اس کے لیے دردِ سر بن گئی تھی۔

''دیکھو رضیہ! عارف نے بات کی وضاحت کرنا چاہی۔

''میرا خاندان اس قدر غریب نہیں۔'' وہ پھر چیخی۔ ''ابھی شادی کو جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے اور تم نے مجھے رلانا شروع کر دیا۔''

''رضیہ!'' عارف بڑی نرمی سے بولا۔ ''یہ سوچنے کی بات ہے۔ میری آمدنی بہت زیادہ نہیں ہے۔ تم عقل مند ہو، پڑھی لکھی ہو، خود سمجھ سکتی ہو۔''

''میں کچھ نہیں سمجھتی، کچھ نہیں جانتی۔'' وہ ہٹ دھرم تھی۔ ''ہاں یا نا؟''

''نا''۔ وہ زور سے چلا اُٹھا۔

رضیہ نے اپنا سر لحاف کے اندر چھپالیا۔ عارف اپنے کام کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ خود دیر تک سونے کا عادی تھا لیکن رضیہ صبح صبح ہی رسوئی گھر میں جا کر اس کے لیے ایک پیالی چائے بنا کر لاتی اور تپائی پر رکھ کر کہتی۔

''حضور اٹھیے۔ اب تو آٹھ بج رہے ہیں۔''

لیکن آج جو اس کی آنکھ کھلی تو وہ حیران ہوا۔ گھڑی نو بجا رہی تھی۔ جلدی سے بستر سے باہر نکل آیا۔ نوکر باغ میں پھولوں کو پانی دے رہا تھا۔

''عزیز! بیگم صاحبہ کو ذرا بلاؤ؟

نوکر نے گھور کر اپنے مالک کی طرف دیکھا اور پھر بول اٹھا۔ ''صاحب وہ تو سویرے ہی بڑے صاحب کے ہاں چلی گئیں۔''

عارف پریشان ہوا۔ وہ پھر اپنے کمرے میں آیا۔ سامنے ٹیبل پر رضیہ کا مختصر سا خط تھا۔

''میں جا رہی ہوں۔ مجھے یہ قدم اُٹھا کر افسوس نہیں ہو رہا ہے۔ تم سے شادی کرنے سے پہلے ممی نے کہا تھا۔ دیکھ رضیہ وہ خوب صورت، ہونہار اور محنتی ضرور ہے لیکن تمہارے قابل نہیں۔ تم ساری عمر پچھتاتی رہو گی...... خدا حافظ!''

''رضیہ'' اس کی ماں چیخ اٹھی اور دوڑ کر بیٹی کو گلے لگا یا۔ باپ بیٹی کو سویرے سویرے دیکھ کر کچھ حیران ہوا۔ وہ دونوں بریک فاسٹ ٹیبل پر اپنے بچوں کا انتظار کر رہے تھے۔ اس سے پہلے کوئی اور بات ہوتی، آفاق، مشتاق، عطیہ اور پروین بھی آ گئے۔ اپنی بہن کو دیکھ کر ایک عجیب سا شور ہوا۔

''رضیہ باجی! آپ ہمارے ساتھ کب تک رہیں گی؟ عطیہ نے پوچھا۔

''بکواس بند کر۔'' اس کے باپ نے کہا۔ ابھی تو آئی ہے اور تم جانے کی سوچ رہی ہو۔''

رضیہ کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ چیخ کر کہہ دے۔ ''میں ہمیشہ کے لیے آئی ہوں لیکن اچانک اس کا گلا خشک ہو گیا۔ بات بدلنے کے لیے اس نے مشتاق سے پوچھا:

''لاٹ صاحب آج تم کیا کر رہے ہو؟''

''باجی! وہ نوکری چھوڑ کر اب دوسری جگہ کام کر رہا ہوں اور......''

''اور تم بتاؤ آفاق۔'' رضیہ نے مشتاق کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''اپنی بات ہی اور ہے۔ اس وقت ڈیڈی سے سوٹ کے لیے روپے نکالنے کی

سکیم سوچ رہا ہوں۔‘‘

’’ہاں ہاں‘‘ ۔باپ بول اٹھا۔’’ ہر ایک کی نظر تجوری پر ہے۔اس مہینے ابھی تک ایک ہزار روپے اڑا چکا ہے۔کبھی پارٹی، کبھی کچھ۔‘‘

’’آہا۔‘‘ پروین نے کہا۔’’خوب یاد دلایا پاپا نے،کل میری سہیلیاں آرہی ہیں۔‘‘

’’یہ لو‘‘ باپ نے کہا’’ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔‘‘

’’چھوڑو جی‘‘ ماں نے کہا’’یہ تو روز ہی ہوتا ہے۔پیسے کے لیے کون جان دیتا ہے آج رضیہ بیٹی آئی ہے۔خوب عیش کرو۔‘‘

رضیہ سوچنے لگی۔’’شاید یہی ایک بات ہے۔اسی کی کمی ہے......ماں نے ٹھیک ہی کہا، پیسے کے لیے کون جان دیتا ہے۔صرف ایک عارف ہی ہے جو دن رات کام کرتا ہے اور ایک معمولی پارٹی دینے سے انکار کرتا ہے۔‘‘

یہ سب اس کے رشتہ دار تھے۔اس کے اپنے تھے ایک ہی خون، ایک ہی رنگ، ایک ہی روح وہ ان سے پیار کرتی تھی، ان کو چاہتی تھی وہ سب ایک ایک کر کے کمرے سے جانے لگے۔کمرے میں صرف ماں اور وہ گئیں۔

’’ممی! مشتاق نے وہ نوکری کیوں چھوڑ دی؟‘‘

’’بس وہی پرانی بات وہاں کام کم اور پیسے زیادہ۔یہاں کام زیادہ اور پیسے کم۔‘‘ ماں نے کہا۔’’اور پھر تمہیں معلوم ہے اس گھر میں روپے کی کس کو پروا ہے۔‘‘

اتنے میں کوئی اندر آیا۔رضیہ کی بڑی بہن رقیہ تھی۔

’’رقیہ آپا!‘‘ رضیہ نے کہا۔’’میں دو گھنٹے سے بیٹھی ہوں اور آپ نظر نہیں آئیں۔‘‘

’’بے......بی......!‘‘ وہ کہہ اٹھی۔’’بچے کہاں چھوڑتے ہیں گھر تو دو قدم کے فاصلے پر ہے لیکن مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں کہ تم آئی ہو۔‘‘

وہ دونوں ہنس دیں۔

’’بے بی! تم کیسے آئی ہو۔چیزیں خریدنے؟ آہا، بازار میں آج کل نت نئی ساڑھیاں آئی ہیں۔کل جاوید نے میرے لیے دو خوبصورت ساڑھیاں خریدی ہیں۔چلو تم

بھی آج خریدو“۔

”آپا کہاں کی ساڑھیاں؟ میرے پاس اتنے کپڑے ہیں۔اور پھر فضول خرچی سے فائدہ؟“ لیکن دوسرے لمحے وہ خود ہی اپنے جواب پر حیران رہ گئی۔ وہ سوچ کچھ رہی تھی، کہہ کچھ رہی تھی۔ عارف بھی بالکل اسی طرح کہتا ہے۔”میرے اللہ......!“ وہ سوچنے لگی۔”مجھ میں یہ تبدیلی کیوں؟ دل اور دماغ میں یہ تضاد کیوں؟“

ایسے میں رقیہ کا خاوند جاوید آ گیا۔

”رضیہ دی گریٹ، کب آئیں تم؟ ہمارا دوست عارف کہاں ہے؟“

”حسب معمول اپنے کام میں مصروف ہے۔“

”اچھا کرتا ہے۔کاش میرے پاس فارم ہوتا۔میں عارف سے بات کروں گا۔ شاید وہ مجھے اپنا پارٹنر بنا دے!“

”اس کے پاس ہے ہی کیا جو تمہیں پارٹنر بنا دے!“ رقیہ نے کہا

”کیوں؟“ رضیہ نے جلدی جلدی کہا۔”خدا کا دیا سب کچھ ہے۔اس نے کئی بار دولھا بھائی کو اکٹھے کام کرنے کے لیے کہا بھی۔“ وہ دل ہی دل میں خوش ہوگئی۔اس نے ایک بار پھر عارف کے بدلے لڑنا شروع کیا وہ خود حیران تھی۔لڑ کر تو وہ عارف سے آئی تھی اور یہاں اس کے لیے لڑ رہی تھی

"EXCELLENT"! جاوید نے کہا۔”سن رہی ہیں آپ محترمہ رقیہ بیگم جی یہ ہوئی ایک IDEAL بیوی!“

”تم چپ کرو جی تمہیں تو صرف باتیں بنانا آتی ہیں۔“ رقیہ نے جاوید کو ڈانٹا۔ رضیہ بغیر کسی وجہ کے اچانک خوش ہوگئی۔

آدھا دن تو یوں ہی گذرا۔اتنی سی مدت میں بہت ساری باتیں ہوئیں کہ اسے سوچنے کا موقع بھی نہ ملا، البتہ وہ اس دوران یہ سوچتی رہی اب عارف اٹھا ہوگا۔اب چائے پی ہوگی، اب فارم پر چلا گیا ہوگا، اب یہ کرتا ہوگا، اب وہ کرتا ہوگا اب وہ یہ سوچ رہی تھی کہ اس ماحول میں وہ رہ سکے گی یا نہیں کہ اچانک مشتاق کسی کونے سے نکل گیا۔

''آپا ذرا بات تو سنو۔'' وہ گھبرا سی گئی۔ ''آپا!'' وہ اور قریب آ کر بولا۔ ''مجھے کچھ روپے چاہئیں۔'' وہ حیرت سے مشتاق کو دیکھتی رہی۔

''کیوں؟ کوئی نیا سوٹ بنانا ہے۔''

''نہیں آپا یہ بات نہیں۔''

''مطلب''

''آپا میرے پاس کمپنی کے کچھ روپے تھے وہ خرچ کر بیٹھا ہوں۔''

''لیکن مشتاق!'' رضیہ نے کہا۔ ''تمہیں اچھی معقول تنخواہ ملتی ہے گھر میں ایک نیا پیسہ بھی نہیں دیتے تم۔ پھر یہ خرچہ؟''

''سکینہ کے لیے وقت بے وقت تحفے لاتا رہا۔''

''تو یہ دل کی بیماری ہے۔ یہ بری بات ہے مشتاق۔ جس لڑکی کے ساتھ اس وقت تحفوں کے بغیر تمہاری نبھ نہیں سکتی شادی کے بعد کیا ہوگا۔''

رضیہ اس بات پر بھر حیران رہ گئی۔ وہی عارف کے سوچنے کا ڈھنگ؟

''آپا دس ہزار روپے کی ضرورت۔''

''مشتاق میں کچھ نہیں کر سکتی۔ تمہیں اس قدر فضول خرچ نہیں ہونا چاہئے''۔ وہ اپنے سوچنے کے انداز پر پھر حیران ہو گئی اتنی تبدیلی کیسے؟

''تم ماں سے کہو، وہی ایک راستہ ہے۔ ہاں......''

مشتاق جانے لگا تو رضیہ نے کہا۔

''سنو مشتاق تمہارے پاس ایک ٹوٹی ہوئی کار ہے، اسے فروخت کر ڈالو۔ تمہیں ان آدمیوں سے میل ملاپ رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں جو تمہارے انکم گروپ میں نہ ہوں۔ ہمیشہ وہی کرو جو تم کر سکتے ہو، کماؤ اور کھاؤ۔ فضول خرچی سے بچو...... یہ ایک طریقہ ہے۔'' وہ خاموش ہو گئی، مگر اسے محسوس ہوا، جیسے وہ نہیں عارف بول رہا ہے۔ وہی انداز، وہی طریقہ، وہی الفاظ!

''آپا تم صحیح کہتی ہو۔'' مشتاق آہستہ سے بولا۔ ''میں کوشش کروں گا۔ ماں کو کہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں اپنی کار کو فروخت کروں گا۔''

مشتاق باہر جانے لگا۔ جاتے جاتے اس نے پوچھا۔

''رضیہ آپا تم رات کو یہاں رہو گی نا؟''

''نہیں...... عارف اکیلا ہوگا۔'' اچانک اس کے منہ سے نکل گیا۔ وہ خود ہی اس فیصلے پر حیران تھی! یہ سب اتنی جلدی میں ہوگیا کہ وہ حیران رہ گئی۔ وہ پھر سوچنے لگی۔

''نہیں مجھے اپنے رشتہ داروں سے پیار ہے۔ ماں باپ بھائی بہنوں سے پیار ہے، میں ان کو چاہتی ہوں۔''

''لیکن مجھے پیار کرنے سے کون روکتا ہے!'' اس کے ذہن میں خود ہی ایک سوال ابھرا۔ ''لیکن میں اب وہ رضیہ نہیں رہی............ میرے سوچنے کا ڈھنگ، میرے رہنے کا طریقہ، میرے کام کرنے کا انداز، سب کچھ بدل گیا۔ نہ میں ان جیسی باتیں کرتی ہوں اور نہ ہی کرنا چاہتی ہوں۔ میرا اپنا گھر ہے اس گھر میں میرا اپنا عارف ہے اور عارف کا ......وہ خود ہی شرما گئی۔

جب وہ واپس گھر پہنچی، اندھیرا اُتر چکا تھا۔ مکان کی کسی بھی کھڑکی سے روشنی نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ وہ گھبراسی گئی۔

عارف جلدی گھر آیا کرتا تھا۔ پھر آج ......وہ اگر گھر پر نہیں تو پھر کہاں ہے۔ کہیں وہ بھی تو نہیں چلا گیا۔ آخر اسے بھی حق ہے اور پھر زیادتی تو میری تھی۔ اگر میں نہ جاتی تو وہ کہاں جاتا۔ وہ خاموشی سے اپنے باغ کی طرف دیکھتی رہی اسے نوکر کا خیال آیا۔ وہ بھی غائب تھا۔ پھر یہ جان کر تسلی ہوئی آج سنیچر کا دن ہے نوکر چھٹی پر ہوگا۔

کہیں عارف نے جان بوجھ کر چھٹی تو نہ دے دی۔ وہ پھر سوچنے لگی۔ ''خودکشی!''

اس کے جسم کا انگ انگ کانپ اٹھا۔ ''عارف...... عارف......!''

وہ پاگلوں کی طرح چیخی اور رونے لگی۔

اچانک برآمدے میں کوئی نکلا۔

وہ بھاگتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔

''عارف......! میں گھر آئی ہوں...... اپنے گھر آ گئی ہوں......'' اور روتی رہی۔

اجنبی چہرے

شام پھیل گئی!

رنگ بکھر گئے!!

بکھر کر کینوس پر پھیل گئے، پھیل کر سنور گئے، سنور کر ایک صورت میں ڈھل گئے!!!

پھر ایسا ہوا کہ شعلوں کی ہوا چل گئی، شعلے بھڑک اٹھے، بھڑک کر پُرسکون ہو گئے اور ایک تصویر بن گئی۔

میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں، شاستروں میں لکھا ہے من بھٹکنے لگے تو اپنی آنکھیں بند کرلو تمہیں سکون ملے گا، من کا سکھ مل جانے سے تن کے سارے دکھ ڈھل جاتے ہیں۔ میں نے دیکھا آنکھیں بند کرنے سے من کا سکھ نہیں ملتا، بس اندھیرا چھا جاتا ہے اور اس اندھیرے میں ڈوب کر اپنے جیون کی کہانیاں یاد آتی ہیں۔ ارشد کا خیال آتا ہے تو میرا سارا بچپن نظروں کے سامنے پھر جاتا ہے، میرا لڑکپن اُسی پرانے رنگ میں ایک نیا روپ اپنا کر نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا ہے اور جب یہی رنگ و روپ بچپن کی حدوں سے نکل کر کسی اجنبی لمحے سے جا ملتے ہیں تو بیک وقت کئی آنکھیں، کئی مسکراہٹیں اور کئی چہرے ایک دوسرے میں گھل مل جاتے ہیں اور جوانی کے یہ تھکے ماندے لمحے فرار کی راہ تلاش کرتے ہیں تو ایک سراپا سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔

ایک بے حد بدصورت سراپا؟

یہ ہُما ہے.......... ہما کو میں نے چالیس برس پہلے دیکھا تھا، اور پہچانا تھا چالیس

برس پہلے جب میں صرف دس برس کا تھا اور ہما چودہ برس کی۔ مجھ سے چار سال بڑی، جان پہچان کی بات تو دوسری ہے، اس کا سراپا میرے ساتھ رہا ہے، کبھی میری پرچھائیں بن کر، کبھی میرا روپ بن کر، کبھی دکھ اور کبھی سکھ بن کر۔

بات جسموں کے ٹکرانے کی تھی، رنگوں کے بکھرنے کی تھی اور ایک تصویر بن جانے کی تھی۔ اور پھر ایسا ہوا۔ میرے بچپن کا لمحہ لوٹ آیا۔ ممی نہیں، ابا نہیں اور ہما بھی نہیں ہاں انکل آ گئے ہیں۔......

''کیا بات ہے ارشد، آج تم خاموش کیوں ہو، ہنستے کیوں نہیں؟''

سوچ رہا ہوں انکل سید کی بات کا کیا جواب دوں، میں آج خاموش کیوں ہوں، ہنستا کیوں نہیں۔ سید انکل اکثر ہمارے گھر آتے ہیں اور وہ جب بھی آتے ہیں انھیں دیکھ کر مسکراتا ہوں، خوب مسکراتا ہوں۔ انھیں دیکھ کر ممی بھی مسکراتی ہیں، لیکن آج مجھے خاموش پا کر شش و پنج میں پڑ گئے ہیں۔ شاید اس لئے کہ میں مسکرایا نہیں، شاید اس لیے کہ ممی گھر میں نہیں ہے، کاش میں انکل سے بتا سکتا اپنی اُداسی اور خاموشی کا سبب، ابا اور امی لڑ پڑے تھے، وہاں سید انکل کی ہی کسی بات پر لڑ پڑے تھے، ابا نے غصے میں آ کر سید انکل کی بات چھیڑی تھی۔

ابا نے کہا تھا ''تم سید سے پیار کرتی ہو''۔

امی نے کہا تھا ''تم اس کالی کلوٹی ہما کو چاہتے ہو''۔

''یہ جھوٹ ہے''۔

''یہ سچ ہے، میں نئی آیا رکھ بھی لی اور تم اب بھی ہما کو رکھنے کے لئے ضد کر رہے ہو''۔

''صرف اس لیے کہ ارشد ہما کے بغیر نہیں رہ سکتا''۔

''یہ تو ایک بہانہ ہے، اور تم ایسے کہہ رہے ہو جیسے ارشد صرف تمھارا بیٹا ہے''

''شریفہ''

یہ لڑ پڑنے کی بات تو روز ہی ہوتی تھی لیکن آج کچھ شدت اختیار کر گئی!

اسی لیے آج میں اکیلا ہوں، اور ہما بھی چلی گئی۔

میں اپنی نئی آیا کا ہاتھ پکڑے گھوم پھر کر اسی کمرے میں لوٹ آیا ہوں، اس کمرے میں سب کچھ ویسے ہی پڑا ہے، سامنے بک شیلف پر کتابیں ہیں اور پلنگ کے سرہانے دیوار پر ابا اور امی کی تصویر آویزاں ہے اور اس کے ساتھ ہی میری تصویر ہے ہما کے ساتھ، ادھر کونے میں ریڈیو پڑا ہے، خاموش بے آواز اور آتش دان کے ساتھ ہی دیوار پر ایک بڑی تصویر لٹک رہی ہے، یہ تصویر ایک شام سید انکل لے آئے تھے، اس تصویر میں رنگ رنگ کی مختلف لکیریں ہیں، سرخ و سپید، زرد پیلی اور کالی لکیریں، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان رنگ برنگی لکیروں میں کچھ صورتیں ابھر رہی ہوں، ایک بچے کی، ایک عورت کی اور ایک مرد کی، یہ بچہ شاید میں ہوں، یہ عورت ممی ہے اور مرد انکل سید، یہ ٹیڑھی میڑھی لکیریں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئی ہیں، ایک دوسرے میں تحلیل ہو گئی ہیں۔

انکل سید اس تصویر کے بارے میں کچھ کہہ رہے ہیں۔

میں ہما سے کچھ کہہ رہا ہوں۔

اور ابا...... ابا خاموش ہیں اور کچھ سوچ رہے ہیں، شاید ممی کے بارے میں، شاید انکل سید کے بارے میں...... اور شاید اس تصویر کے بارے میں اور یہ تصویر دیکھ کر میں اکثر سوچتا ہوں میری ماں کون ہے، ممی یا ہما، میرے ابا کون ہیں، انکل سید یا...... اور ابا وہ تو جا چکے ہیں، جانے والے لوٹ کر نہیں آتے۔

اور یہ نئی آیا ہے، پہروں ادھر ادھر لیے پھرتی رہتی ہے شلف پر رکھی یہ کتابیں بھی عجیب سی معلوم ہو رہی ہیں، میری طرح اداس اور کھوئی کھوئی سی......

"ممی...... پڑھو الف...... ب، تم تو انکل کے ساتھ انگریزی میں باتیں کرتی ہو، میں بھی انگریزی بول سکتا ہوں...... "My Darling mumy I love You"

"ارشد خاموش ہو جاؤ، میرے سر میں درد ہے......" انکل سید آتے ہیں اور ممی کہتی ہے۔ آؤ ارشد میں تمھیں بتاتی ہوں کہ انگریزی میں کیسے باتیں کرتے ہیں۔ Love You Very Much اور یہ کہتے ہوئے انکل سید کی انگلیاں کال بیل پر چلی جاتی ہیں۔ ہما

آتی۔

’’کیا ہے صاحب‘‘

’’ارشد کو لے جاؤ‘‘۔

اور میں...... ہما کے ساتھ نیچے کمرے میں چلا جاتا!

’’ارشد تم بڑے ہو کر کیا بنو گے‘‘ ہما مجھ سے پوچھتی۔

’’میں آرٹسٹ بنوں گا، تصویریں بناؤں گا۔ تمھاری بھی ایک تصویر بناؤں گا‘‘۔

انکل چلے گئے، ممی بھی نہیں، ابا بھی نہیں اور ہما بھی نہیں۔

میرا بچپن، میرا لڑکپن۔

صبح پھیل رہی ہے، ممی انکل سید کے ساتھ کہیں دور چلی گئی ہیں، ہما نے کسی کو اپنا لیا، ابا نے خودکشی کر لی، سب نے اپنی اپنی راہیں اپنا لیں۔ ماضی کے دھندلکوں میں جھانکنے سے صبح کے اجالے نظر نہیں آتے، ماضی کی دھندلکوں میں جھانکنے کے لیے آنکھیں بند کرنا پڑتی ہیں لیکن آنکھیں بند کرنے سے ہر سمت اندھیرا بکھر جاتا ہے اور اس اندھیرے میں ڈوب کر جیون کی کہانیاں یاد آتی ہیں۔ اور......؟

اور میرا بچپن بیت گیا، لیکن میں نے وہ رنگ روپ نہیں دیکھے جن کے سہارے انسان کا مستقبل بنتا یا بگڑتا ہے، وہ نشیب و فراز نہیں دیکھے جن کی بدولت منزل ملتی ہے، میں نے کبھی کسی کے ساتھ بچپن کے گھروندے نہیں بنائے، کسی گھر کے خواب نہیں دیکھے جس کے آنگن میں میری ان دیکھی محبوبہ کے قدموں کے نشان ہوں، مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ جب میں نے ہوش سنبھالا میرا بچپن بیت چکا تھا، لڑکپن کی باتیں بیت چکی تھیں وہ گھروندے ڈھ چکے تھے، وہ خواب ٹوٹ چکے تھے اور جب میں نے ہوش سنبھالا میری نئی آیا بھی جا چکی تھی، میں اپنے ہی گھر میں اکیلا بھٹک رہا تھا اور کمرے کی دیوار پر وہ تصویر اب بھی لٹک رہی تھی، ایک بچہ، ایک عورت اور ایک مرد......؟

ان ہونٹوں پر اب کوئی گیت نہیں ابھرتا

لمحے بدلتے رہے، ان کا سفر جاری رہا۔ تصویر میں رنگ بھرے جا رہے تھے اور

ایک صورت ابھر رہی تھی۔ میں خود اس کی تصویر بنا رہا تھا۔

''کتنے دن اور''

''سائرہ بس دو دن اور''

''آج کیا بنا رہے ہو''

''تمھارے کانوں کی بالیاں''

''کانوں کی بالیاں'' سائرہ پوچھ لیتی ہے۔

''ہاں سونے کے رنگ کی بالیاں جو ہلتی جھولتی نظر آئیں گی جیسے روشنی بکھیر رہی ہوں''۔

''ذرا قریب آؤ ارشد تو میں تمہارے کانوں میں ایک راز بکھیروں''۔

جسم قریب آئے، رنگ بکھر گئے، شعلوں کو ہوا مل گئی اور میں نے دوسرے دن اپنے آپ کو آرٹ اسکول کے گیت کے باہر پایا...... اور میں اپنی زندگی کی پہلی محبت پر روتا رہا۔

فاصلے ہمیشہ اپنی جگہ کھڑے رہتے ہیں صرف راہی کے چلنے کی سکت پر منحصر ہے اس کی سکت قائم رہی تو فاصلے خود ہی اپنا وجود کھو بیٹھتے ہیں، جب فاصلے طے ہوئے تو منزل خود ہی میرے قدموں کے قریب چلی آئی۔

اور میں نے اپنے کو ارشد مختار کے روپ میں پایا۔

ارشد مختار...... ایک بڑا مقبول اور مصروف مصور۔

میری تصویروں کی پہلی نمائش تھی، کئی تصویریں تھیں، ہر تصویر کا رنگ الگ الگ تھا، موضوع الگ الگ تھا، اسلوب الگ الگ تھا، ایک تصویر تھی اور اس تصویر میں ایک افریقی لڑکا، کلا بھجنگ، ایک بے پناہ سپید لڑکی سے اپنی غلامی کا انتقام لیتا نظر آرہا تھا۔ دلچسپ تصویر تھی۔

ڈاکٹر تاج یہ تصویر دیکھ کر مجھ سے الجھ پڑی اور بھری محفل میں اس تصویر کے خلاف ایک لکچر جھاڑ گئی...... ماڈرن آرٹ پر اس نے کچھ لطیفے بھی سنائے، ان لطیفوں پر

قہقہوں کا ایک طوفان امڈ پڑا، میں جان بوجھ کر خاموش رہا...... لیکن ایک شام جب خوب برفباری ہو رہی تھی اور میں نے اپنے ایک ڈاکٹر دوست کے ہاں مدعو تھا، ڈاکٹر کول کے کمرے میں داخل ہوتے ہیں میں نے تاج کو دیکھا، کچھ اور بھی لوگ تھے، کچھ عجیب سا ماحول تھا گرم گرم اور ڈاکٹر تاج کہہ رہی تھی۔...... بس کیا کہوں، سرمئی آنکھوں، لمبے سرخ بالوں اور مرمریں جسم والی مس ورلڈ کتنی خوبصورت ہے۔ اور اس کے بعد ایک پراسرار سی خاموشی چھا گئی اور سب میری طرف دیکھ رہے تھے، اب تک میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔

میں نے کہا ''ڈاکٹر تاج نے کہاں دیکھا ہوگا۔ کوئلے کی کان میں کام کرنے والا مزدور، کھیتوں میں کام کرنے والا جفاکش کسان۔ آپ نے مچھلیاں فروخت کرنے والی اس کم سن لڑکی کو کہاں دیکھا ہوگا، ڈاکٹر اس کے من میں چھپی ہوئی تمناؤں میں بھی ایک انمول خوبصورتی ہے ہاں صرف نظر نظر کی بات ہے''۔

ڈاکٹر تاج خاموش رہی، اس کے ساتھ والے کرسی پر بیٹھے اقبال نے کہا۔ ''زندگی میں سب کے ساتھ کوئی نہ کوئی المیہ وابستہ ہے، کوئی خوبصورت یا بدصورت المیہ، ارشد کی زندگی کا بدصورت لمحہ وہ کم سن لڑکی ہے اور ڈاکٹر تاج کی زندگی کا خوبصورت المیہ مس ورلڈ لیکن ہم سب یہاں المیوں کی تلاش میں نہیں آئے ہیں، پھر یہ برف آلود تنہائیاں۔ تم سب کو دیکھ کر مجھے محسوس ہوتا ہے میں ایک کڑوے کسیلے دھوئیں سے بھرپور ماحول میں دھکیلا گیا ہوں''۔

"Will You Shut Up Man" پروفیسر داس نے چلاتے ہوئے کہا۔

باہر برف نے کچھ زیادہ ہی شدت اختیار کر لی، اندر کمرے میں سب لوگ میری طرف دیکھ رہے تھے۔

تاج نے کہا...... ''آپ نے مرمریں جسم کو بھی اپنی ٹیڑھی میڑھی لکیروں میں گم کر دینے کی کوشش کی ہے۔ آپ کسی مرمریں جسم والی لڑکی کو اس کے اصلی رنگ وروپ میں کینواس پر بکھیر دیتے تب آپ کو احساس ہوتا کہ خوبصورتی کا معیار کیا ہوتا ہے۔ اور کہاں ختم ہوتا ہے کسی تن میں چھپی تمناؤں میں یا کسی کی نیلگوں آنکھوں کی گہرائی میں''۔

وفعتاً میں نے ڈاکٹر تاج کی آنکھوں میں جھانکا اور پہلی بار محسوس ہوا کہ ان پر کالا

چشمہ چڑھا تھا، وہ میری اس حرکت پر مسکرا دی۔

کئی دن گزر گئے، میں نے کئی بار ڈاکٹر تاج کو کار میں آتے جاتے دیکھا۔ وہ مجھے دیکھ کر بس مسکرا دیتی، لیکن اس مسکراہٹ میں ایک طنز تھا، ایک چوٹ تھی۔ اور ایک شام میں اپنے رنگ اور برش لے کر اس کے کلینک جا پہنچا۔

ڈاکٹر تاج کا روپ میرے سامنے کھڑا ہے۔

''کیا فیصلہ کر لیا ہے''

''ابھی تو آپ کی تصویر بنے گی''۔

اور پھر ایسا ہوا رنگ کینوس پر بکھر گئے۔

''کچھ کہنا چاہتی ہو''

''ہاں''

''کہو''

''کتنے دنوں سے آگ کے شعلے اپنے اندر دبائے بیٹھی ہوں''۔

''تم کہنا کیا چاہتی ہو''۔

''میں تم سے پیار کرتی ہوں ارشد......لیکن......لیکن......''

''لیکن کیا''

''ارشد پیار صرف دو جسموں کا ملاپ نہیں، پیار کچھ اور بھی مانگتا ہے، پیار کی کچھ ضرورتیں ہیں''۔

''کھل کر بات کرو تاج''

''میں جانتی ہوں ارشد، تمھارے پاس فن ہے، نام ہے، لیکن کوٹھی نہیں، کار نہیں، اور تمھارا نام، تمھارا فن میری ضرورتوں کو پورا نہیں کرسکتا''۔

میں نے اور قریب آ کر جھانکا، یہ وہ آنکھیں نہ تھیں جو میرے من کی گہرائیوں میں آباد ہو چکی تھیں، ان آنکھوں میں آج ایک بازار تھا، پیار و محبت کے اس الف لیلوی بازار میں جادوئی اشارے تھے، رنگین ادائیں تھیں۔ اور اس بازار میں میرے لئے، میری

محبت کے لیے کوئی خریدار نہ تھا۔ ڈاکٹر تاج مسنر ڈاکٹر تاج الدین بن گئیں۔

لمحے سرکتے رہے۔

''نئی کوٹھی مبارک ہو ارشد''

''ہاں گھر نیا ضرور ہے لیکن میں وہی ہوں روپ''

''اس گھر میں اکیلے رہ کر تمھیں ڈر تو نہ لگے گا''۔

''پہلے کچھ ایسا ہی سوچا تھا لیکن اب''

''اب کیا ہے''

''تم جو آ گئی ہو''

روپ کے ہونٹ کھلے بے اختیار ہنس پڑی، مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کنول کے پتوں پر شبنم کے قطرے مچل اٹھے ہوں۔ روپ کا پورا نام روپ متی ہے۔

میری نئی کوٹھی کا نام روپ بھون ہے۔

جب میں اپنے روپ بھون کی طرف دیکھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے رانی روپ متی سنگ مرمر سے ترشی ہوئی وینس کی مورتی بن کر گلاب کی بیلوں کا سہارا لیے میری طرف دیکھ رہی ہے۔ روپ بھون اور روپ متی ایک ہیں، ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہیں۔

تاج نے کہا تھا۔ پیار کی تکمیل کے لیئے ایک کوٹھی۔

''روپ کب آؤ گی''

''میرا مطلب ہے میرے دل کے روپ بھون کو اپنانے کے لئے''۔

شام پھیل چکی ہے۔

''روپ''

''کیا ہے''

''تمھارا یہ بھیگا بھیگا سمٹا سمٹا سا بدن دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے شفق جیسے زعفران میں نہا کر آئی ہوں۔

......ایک لمبی سانس

''سنو''

''کیا ہے''

''تم نے ڈیڈی سے بات کی''

''ہاں''

''کیا کہتے ہیں وہ''

''وہی جو سب کہتے ہیں۔ تمھارے پاس نام ہے، فن ہے، کوٹھی کار ہے لیکن......''

''لیکن کیا''

''تمھارا کوئی خاندان نہیں''

''میرا خاندان...... پیار اور شادی سے خاندان کا کیا تعلق؟''

''ہے۔ بہت بڑا تعلق ہے، تمھاری عزت، شرافت...... میرے پاپا کہتے ہیں کہ تمھارے ڈیڈی نے خودکشی کر لی تھی، تمھاری ممی......''

''روپ''۔

اور میری جوانی بیت گئی۔

میں نے گھر بنایا، دریائے جہلم کے کنارے، جہلم بہتا ہے اور میں اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھتا ہوں، سوچتا ہوں، آج میرے پاس فن ہے، نام ہے، گھر ہے، بنک بیلنس ہے۔ سبھی کچھ تو ہے لیکن میں پھر بھی اکیلا ہوں۔

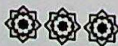
''ممی نہیں''

''ابا نہیں''

''ہما نہیں''

سائرہ، تاج نہیں، رانی روپ متی نہیں۔

چند تصویریں ہیں، ایک بچے کی، ایک عورت کی، ایک مرد کی، ایک اور تصویر ہے بغیر آنکھوں والی لڑکی اور ان آنکھوں میں تلاش ہے۔ ایک بھرپور تلاش جانے کس کی!!۔



رشتے

آرکسٹرا بج اٹھا اور سازوں کی لہروں کے ساتھ ساتھ سفید چکنے فرش پر جوان جسم تھرکنے لگے۔ سیٹھ جی کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ اس پر وہی پرانی جنوبی کیفیت طاری ہوئی اور وہ چیخ اٹھا۔

"آصف"

"جی"

"کمرہ کھول دو۔ ہم اوپر جارہے ہیں۔"

"بہت اچھا سیٹھ!"

آصف کے ہونٹوں پر ایک زہر خندہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ جانتا تھا کہ جب آرکسٹرا کی دھنوں پر جوان جسم تھرکنے لگتے ہیں تو سیٹھ جی کو اپنا مخصوص کمرہ یاد آجاتا ہے۔ وہ تیز تیز قدموں سے اوپر کی طرف جانے لگا، جہاں ہوٹل کا کمرہ ۱۰۱ حسب معمول اس کا منتظر تھا۔ اس نے ابھی دروازہ کھولا ہی تھا کہ سیٹھ جی نشہ میں دھت ایک سہمی سہمی لڑکی کو ساتھ لے کر کمرے میں داخل ہوگئے۔ آصف نے لڑکی پر ایک بھرپور نظر ڈالی۔ وہ گھبرا سی گئی، مگر آصف نے اس کی گھبراہٹ کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

"آصف"

"جی سیٹھ"

"وہسکی......" سیٹھ جی کے نشے میں ڈوبی ہوئی آواز کمرے کی دیواروں میں جذب ہوکر رہ گئی۔

آصف بغیر کوئی جواب دیئے نیچے چلا گیا۔

وہسکی اور دوسرے لوازمات لے کر جب وہ واپس آیا تو حسب معمول کمرے کے باہر اس کے قدم خود بخود رک گئے...... یہ اس کا معمول تھا، کمرے میں جانے سے پہلے چند لمحے وہ ضرور رک جاتا اور سیٹھ جی کی باتیں سنتا۔ نہ جانے کیوں؟

سیٹھ لڑکی سے کہہ رہا تھا...... ''یہ کمرہ تمہاری فلم انڈسٹری کی کتنی ہی لڑکیوں کیلئے جانا پہچانا ہے۔ ایک دن جب تم فلم انڈسٹری کی ایک بڑی ہیروئن بن جاؤ گی تو اس کمرے کو بھلا دو گی...... مجھے بھلا دو گی...... میرے قریب آؤ ارے تم گھبرا کیوں رہی ہو۔''

''لیکن سیٹھ جی......'' لڑکی نے جواب دیا۔ ''مجھے ابھی کتنی دیر اور انتظار کرنا پڑے گا اور کیا کیا کرنا ہوگا۔ بھگوان کیلئے مجھے اب کام دے دیجئے۔ میں ایک مہینے سے یہاں بھٹک رہی ہوں...... اُف اگر میرے پتا جی کو میری اس حالت کا پتہ چل جائے گا تو وہ مجھے گولی سے اُڑا دیں گے۔ میں گھر سے بھاگی ہی کیوں تھی''۔

سیٹھ جی نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا اور کہا......

''تم گھر سے بھاگیں۔ اس لئے کہ تم فلموں میں کام کرنا چاہتی ہو۔ تم بڑی بڑی رنگین محفلوں کی جان بننا چاہتی ہو۔ جوان دلوں کو چکنا چور کرنا چاہتی ہو، تم نے سوچا تھا تم فلموں میں آؤ گی تو تمہارا نام ہوگا۔ تمہاری شہرت ہوگی۔''

''لیکن سیٹھ جی......'' لڑکی نے حسرت میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہنا چاہا لیکن زبان نے ہونٹوں کا ساتھ نہ دیا۔

''تم گھبراؤ نہیں رانی، میری بات سنو...... میں اپنی نئی فلم کی کاغذی تیاریوں میں لگا ہوں۔ بہت جلد شوٹنگ ہوگی۔ تم خوبصورت ہو، جوان ہو اور میں تمہاری جوانی اور خوبصورتی کا احساس یہاں کے ہر پروڈیوسر کو دلاؤں گا۔ تم میری فلم کی ہیروئن بن کر آرہی ہو۔ پھر تمہارے پاس وہ سب کچھ ہوگا جس کی تم متلاشی ہو اور اس کے بعد مجھے بھول جانا۔ بھول جانا مجھے اُن لڑکیوں کی طرح جنہوں نے میرے ایک ایک اشارے پر آکاش کی بلندیوں کو چھو لیا اور اب مجھے پہچاننے سے انکار کرتی ہیں۔''

لڑکی نے جواب نہ دیا۔ وہ سیٹھ جی کے اور قریب سرک آئی۔

''وہی پرانا فلسفہ...... وہی پرانا کھیل......'' آصف نے اپنے من ہی من میں سوچا اور کمرے میں داخل ہوا۔

وہسکی بہتی رہی، یہاں تک کہ وہ ختم ہوگئی۔ سیٹھ جی نے آنکھوں سے پینا شروع کردیا۔ شام کے سائے رات کی تاریکیوں میں بدل گئے۔ جب صبح کی روشنی نے رات کی تاریکیوں کو نگل لیا تو آصف نے رانی اور سیٹھ جی کو کمرہ نمبر ۱۰۱ سے نکلتے دیکھا۔

سیٹھ جی کی اپنی ایک لمبی کہانی ہے۔ وہ صرف آٹھ سال کا تھا کہ اس کے سر سے ماں باپ کا سایہ اٹھ گیا۔ وہ ابھی نویں جماعت میں ہی پڑھ رہا تھا کہ اس کا چاچا بھی مر گیا۔ اسے پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ لیکن حالات اور قسمت نے ساتھ نہ دیا تھا۔ اس کے ناپختہ شعور نے کچھ ناپختہ سے خواب دیکھے تھے جو مسمار ہو کر رہ گئے۔ اسے زندگی سے نفرت ہوگئی لیکن مرنا آسان نہیں ہوتا اور جینے کیلئے کام کرنا پڑتا ہے۔ محنت کرنا پڑتی ہے۔ خوش قسمتی سے چاچا اس کے نام دس ہزار روپے کی رقم چھوڑ گیا تھا۔ یہ سب روپیہ لے کر اس نے ممبئی کا رُخ کیا۔ یہاں اس نے چائے کی ایک چھوٹی سی دکان کھولی اور کافی پیسہ کمایا۔ اب وہ ٹھیکیداری بھی کرتا تھا۔ پیسہ پیسے کو کھینچتا رہا، تجوری بھرتی گئی۔ ایک دن اس کے ذہن میں ایک بالکل نئی بات آگئی۔ وہ اپنے ایک پروڈسر دوست سے ملا اور اس کے ساتھ مل کر ایک فلم بنانا شروع کردی۔ فلم کی شوٹنگ کے دوران اس نے ایک لڑکی کو پسند کرلیا اور اس سے شادی کر ڈالی۔ وہ اپنی بیوی سے جنون کی حد تک محبت کرنے لگا۔ سنتوش تھی بھی محبت کرنے کے قابل۔ وہ بات کرتی تو محسوس ہوتا جیسے پگھلی ہوئی چاندنی بہہ رہی ہو اور اس کے ہونٹوں پر وہ موہنی موہنی سی مسکراہٹ، فلم تیار ہو کر ریلیز ہوئی اور بے حد کامیاب ہوگئی۔ اب وہ اکیلا دوسری فلم بنانے کی تیاریوں میں لگ گیا کہ سنتوش نے ایک پھول سی بچی کو جنم دیا...... راج۔

''زندگی مزے سے گزر رہی تھی۔ پیسہ تھا، بنگلہ تھا، کار تھی، خوبصورت بیوی تھی، پھول سی بچی تھی...... اور کیا چاہئے تھا۔ ناپختہ شعور نے جو خواب دیکھے تھے، وہ پورے

ہو گئے تھے لیکن اچانک ایک طوفان آ گیا۔ سنتوش نے فلموں میں کام کرنے کی ٹھان لی۔ نہ جانے کیوں اس کے پاس سب کچھ تھا لیکن تحت الشعور میں مشہور ہونے کی لیبل چسپاں ہو گئی تھی یہ خواہش پہلے پہلے سنتوش کے دل میں دبی دبی سی رہی۔ اندر ہی اندر سلگتی اور ایک دن جب اُس نے اپنے پتی سے اس کا اظہار کیا تو وہ چکرا گیا۔ اُس نے آگ پر قابو پانے کی بہت کوشش کی۔ مگر کامیاب نہ ہو سکا اور ایک دن سنتوش گھر کی چار دیواری سے نکل کر فلمی ماحول میں چلی گئی۔ گھر کی چار دیواری میں جو پھولوں کی کیاری ہوتی ہے جس کی خوشبو سے دماغ معطر رہتے ہیں، وہ اجڑ گئی تھی۔ سنتوش ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں لہراتی رہی۔ ایک جام سے دوسرے جام میں ڈوبتی رہی۔ اس نے اپنے دل پر جبر کر کے سنتوش کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے گھر سے بے گھر کر دیا لیکن وہ سنتوش کو نہ بھلا سکا۔ اسے بھولنے کیلئے اس نے شراب کا سہارا لیا۔

اس دوران اس کی دو فلمیں چل پڑیں۔ اب پیسہ بھی تھا، شہرت بھی تھی، فلمی دنیا کے بڑے بڑے فنکار اس کے ایک ایک اشارے کے منتظر تھے، مگر اس نے ہمیشہ اپنی بیٹی راج کو فلمی ماحول، فلمی لوگوں سے دور رکھنے کی کوشش کی۔ وہ راج کو سنتوش کے روپ میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

وقت گزرتا رہا۔

راج جوانی کی منزلوں کو پھلانگتی رہی۔

لیکن وہ سنتوش کو نہ بھول سکا۔ سنتوش سے انتقام لینے کی خاطر اس نے ایک روز ایک عجیب سا فیصلہ کر لیا۔ وہ اُس لمحے اپنی بیٹی راج کو بھی بھول گیا۔ جسے سنتوش نے جنم دیا تھا۔ شاید وہ جنونی ہو گیا تھا۔

چنانچہ اس نے فیصلہ کر لیا ''میں ہر اس لڑکی کو تباہ و برباد کرنے کی کوشش کروں گا جو فلموں میں کام کرنے کا خواب دیکھتی ہے۔ میں انہیں بتا دوں گا فلموں میں کام حاصل کرنے کیلئے کیا کیا کرنا پڑتا ہے؟

اور پھر اس نے ایک بڑا ہوٹل خریدا۔ اس ہوٹل میں ہر رات کتنے ہی ارمان کچلے

جاتے۔ کتنی ہی بوتلوں کو توڑا جاتا۔ خود سیٹھ بھی اب شراب اور لڑکی کے بغیر نامکمل تھا اور اس بات سے ہوٹل کے مینیجر سے لے کر گیٹ کیپر تک ہر کوئی واقف تھا اور پھر آصف تو اس کا خاص نوکر تھا۔ ہوٹل کا کمرہ نمبر ۱۰۱ ہر دوسرے تیسرے روز نئی لڑکی اور نئی شراب کیلئے بے تابی سے منتظر رہتا۔ یہ کمرہ سیٹھ کی ہر حرکت سے واقف تھا اور اس نے آصف کی طرح کبھی اپنی زبان نہ کھولی تھی۔ اس کے سینے میں کتنے ہی تلخ اور شیریں راز مدفن تھے۔ حالانکہ اس نے کئی بار چاہا تھا کہ وہ ان دیواروں میں شگاف پیدا کر دے اور اس دیوانے کو اپنے تنگ و تاریک سینے میں چیر کر رکھ دے یا اس پر ایسے ٹوٹ پڑے کہ اس کا نام و نشان مٹ جائے لیکن وہ مجبور تھا اور اس لئے خاموش تھا۔

وہ بھی ایک عام شام تھی، سیٹھ جی اپنے بنگلے کے برآمد میں بے صبری سے ٹہل رہے تھے۔ کسی کے ٹیلی فون کا انتظار تھا۔ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھا لیا۔

''سیٹھ میں آصف بول رہا ہوں۔''

''کیا ہوا۔''

''سیٹھ جی ہری لال بولتا ہے آج کوئی پروگرام نہیں ہوگا۔''

''ایڈیٹ''! سیٹھ جی کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا اور وہ اب کسی نئے پروگرام کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اچانک اس کی بیٹی راج چلی آئی۔

''پتا جی''

اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔

''ہاں بیٹا! کیا بات ہے؟''

''پتا جی آج ریوتی میں انگریزی فلم Night of the Quarter Moon لگی ہے، میں دیکھنے جا رہی ہوں۔''

''ضرور جاؤ بیٹھا۔''

''آپ بھی آیئے نا......''

''لیکن......''سیٹھ جی نے ٹالنے کی کوشش کی۔

''آپ میرے ساتھ کہیں نہیں جاتے۔آج تو آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر آپ نے انکار کیا تو میں آپ سے بولنا بند کردوں گی۔''اس نے بڑی معصومیت سے کہا۔

سیٹھ انکار نہ کرسکا۔

فلم دیکھنے کے بعد جب وہ سنیما ہال سے باہر نکل آئے تو راج نے اپنے ہوٹل میں کھانا کھانے کیلئے اصرار کیا۔

''تمہاری مرضی!''

راج آج پہلی بار اپنے نئے ہوٹل میں آئی تھی۔اسے یہاں کا ماحول عجیب سا لگا۔سپید چکنے فرش پر جوان جسم تھرک رہے تھے۔موسیقی کے زیر و بم قہقہے بن کر ابھر رہے تھے۔اچانک سیٹھ جی کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔اس پر وہی جنونی کیفیت طاری ہوئی۔

''وہ چلا اٹھا......

''آصف''

''جی!''

''کمرہ کھول دو''

آصف نے راج پر ایک نظر ڈالی اور چلا گیا۔

جنونی کیفیت......شراب......لڑکی......راج؟

''راج''سیٹھ جی نے ڈوبے لہجہ میں کہا۔

''جی!''

''تم بیٹھو میں آرہا ہوں۔''

''جی اچھا!''

راج سازوں کے زیر و بم میں کھوگئی۔

ساز بجتے رہے۔جسم تھرکتے رہے۔

وقت گزرتا رہا...... سیٹھ واپس نہیں آئے۔ یہاں تک کہ آرکسٹرا بجانے والے بھی تھک کر کافی پینے لگے۔

راج کو اپنے باپ کا خیال آیا اور خود بخود اس کے قدم دوسری منزل کی طرف اٹھ گئے۔ اوپر کمرہ نمبر ۱۰۱ کے سامنے آصف کھڑا تھا۔

''شاید پتاجی......'' وہ کمرے کے قریب آئی لیکن ایک لمحہ کیلئے اسے محسوس ہوا جیسے وہ اپنی آنکھوں کی بینائی کھو چکی ہو۔ اس کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اندر کمرے میں سیٹھ کے روپ میں اس کا باپ مدمست پڑا تھا۔ شراب کی کتنی بوتلیں کمرے میں بکھری پڑی تھی۔ عجیب سی حالت تھی۔ سیٹھ کی آنکھیں لال لال سی ہوگئی تھیں۔ اس کے بال بکھرے بکھرے سے تھے۔

''اُو چھوکری کیا دیکھتا ہے۔'' اچانک آصف کی آواز راج کے کانوں سے ٹکرائی۔

''میں تو......!'' اس نے کہنا چاہا لیکن زبان نے ساتھ نہ دیا۔

''آصف اسے اندر آنے دو۔ یہ میری......!'' سیٹھ نے بدمست لہجے میں کہا۔ آصف نے اس کی بات کاٹ دی۔

''پر سیٹھ...... یہ چھوکری تو ابھی بہت چھوٹی ہے، بہت ہی کمسن۔''

راج کی آنکھیں پتھرا گئیں۔

سیٹھ پر سکتہ سا چھا گیا۔ اس کی زبان پر جیسے فالج گر گیا اور اسے محسوس ہوا جیسے وہ اسی کمرے میں زندہ دفنایا جا رہا ہو......!!



پتھر پتھر آئینہ

میرے سرہانے کی کھڑکی بند ہے!

نہ جانے کس نے کیل ٹھونک کر کھڑکی کے دو پٹ بند کردیئے ہیں، کہیں سے بھی اُجالے کی کرن نظر نہیں آتی۔ کبھی کبھی لگتا ہے میرا دم گھٹ کر ہی رہ جائے گا!

کاش اس کھڑکی کے دو پٹ پھر سے کھل سکتے!

سانس ہے تو زندگی ہے، زندگی ہے تو خوشبو ہے لیکن یہاں سارے وارڈ میں مجھے ایک عجیب سی بو محسوس ہوتی ہے، ان دیکھے روگ کی انجانی بو، کھڑکی کے اوپر جو روشن دان ہے اس پر گرد وغبار جم گیا ہے، باہر تیز دھوپ بھی ہو لیکن یہاں تاریکی کا احساس ہوتا ہے۔ روشنی جیسے اپنا راستہ بدل چکی ہے، اس ماحول میں رہ کر میں بھول چکا ہوں کہ آج کون سا دن ہے، کونسی تاریخ ہے، سمے کیا ہے۔

کاش یہ کھڑکی کھل سکتی؟

یہ کھڑکی کھلتی تو میں دیر تک باہر کی دنیا کو دیکھتا، شاید میرا کھویا ہوا سانس مجھے واپس مل جاتا...... کاش بیڈ نمبر آٹھ کے مریض کا بستر اس گوشے میں نہ ہوتا، یہ تو ہر سمے میری نظروں کے سامنے رہتا ہے۔ اس نے تو اپنی کھڑکی کے پٹ خود ہی بند کردیئے ہیں، نہ جانے اسے روشنی سے نفرت کیوں ہے۔ اس نے جیسے اپنے وجود کی کھڑکی کے پٹ بھی بند کر رکھے ہیں۔ وہ اندھیرے میں بھی اپنے چھوٹے سے کھلونے سے کھیلتا رہتا ہے، شاید کھیلتے سمے وہ اپنے بچپن میں لوٹ جاتا ہے۔ بیڈ نمبر چار کے مریض نے یہ کہہ کر مجھے حیران کردیا کہ تین ماہ سے یہاں زیر علاج ہے اور بڑی سنجیدگی کے ساتھ اس کھلونے سے کھیلتا رہتا ہے

......بچوں کا کھلونا، پلاسٹک کا ایک چھوٹا سا گول ڈبہ اور ڈبے کے اندر پھیلے ہوئے مسلسل دائرے۔ پہلے دائرے میں موتی جیسا ایک سفید دانہ اور اس کو آخری دائرے میں لے جانا ایک ہنر ہے، لیکن یہ اس کے بس کی بات نہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس کی آنکھوں میں کبھی بھی خوشی اور مسرت کی ایک ہلکی سی جھلک بھی نظر نہیں آتی۔ صرف نا امیدی، ناکامی اور مایوسی جھلکتی ہے......کاش اس کی آنکھوں میں پوشیدہ یہ یخ بستہ برف پگھل جاتی!

کبھی کبھار مجھے آٹھ نمبر پر رحم بھی آتا ہے۔ سوچتا ہوں کہ اُٹھوں اور اس کھلونے کو توڑ کر موتی کا دانہ آخری دائرے تک پہنچا دوں، پھر نہ جانے کیا سوچ کر صبر کرتا ہوں، شاید ایسا کرنا اس قدر آسان نہیں جس قدر میں سمجھتا ہوں، میں دوسری جانب دیکھنے لگتا ہوں جہاں ایک ستون کھڑا ہے، ایک کھمبا پتھروں کا بنا ہوا جانے کب سے یوں ہی کھڑا ہے......

اگر انسان بھی ایک پتھر ہوتا تو اسے نہ دھوپ کی ضرورت پڑتی اور نہ ہی بارش کی، روشنی کی اور نہ ہی اندھیرے کی اور یہ کھمبا چھت کا بوجھ سنبھالے کھڑا ہے اور انسان اپنا بوجھ بھی نہیں سنبھال سکتا...... مجھے لگتا ہے کہ یہ مریض ایک پہلی ہے، مجھے اس کی ایک بھی بات سمجھ میں نہیں آتی اور نہ ہی اس ہسپتال سے چلا جاتا ہے، ہسپتال آتا ہے انسان صحت یاب ہونے کے لئے، علاج و معالجہ کے لئے لیکن یہ تو دوا بھی نہیں لیتا، میں نے کئی بار اسے دوا پھینکتے ہوئے دیکھا ایک دن جب اس نے کھڑکی کھول کر دوا پھینک دی تو میں نے کہا۔

"یہ کھڑکی کھلی رہنے دو، دیکھو یہاں کس قدر اندھیرا ہے، ہم سب ذرا سی روشنی کے لئے ترس رہے ہیں۔"

اس نے کہا "مجھے روشنی کی ضرورت نہیں۔"

"مگر کیوں" میں نے پوچھا۔

"یہ روشنی میرے کس کام کی جب کہ میں جانتا ہوں کسی بھی وقت کسی بھی لمحے میں نے ہمیشہ کے لئے اندھیروں کو اپنانا ہے۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا مجھے لگا جیسے وہ زندگی کے کچے دھاگے سے لٹکا ہوا ہے، جانے کس کا منتظر ہے، خدا جانے...... میں نے تو کسی کو بھی اس کے آس پاس، آتے جاتے نہیں دیکھا، اس کا کوئی نام بھی نہیں...... صرف بیڈ

نمبر آٹھ، ویسے یہاں کسی کو بھی کسی کے نام کی جانکاری نہیں، ہر مریض اپنے بیڈ نمبر سے جانا جاتا ہے!

کاش یہ کھڑکی کھل سکتی!

مجھے لگتا ہے کہ وارڈ کی ساری ٹھنڈ میرے شریر میں گھس آئی ہے، چاہتا ہوں کہ پرانے وقتوں کی طرح کھڑکی میں بیٹھا رہوں تا کہ میرا کھویا ہوا سانس مجھے واپس مل سکے، کل صبح میں کھڑکی کے جھروکوں سے دیر تک باہر دیکھتا رہا، ہسپتال کے پارک میں پھولوں نے ابھی ابھی نیند سے جاگ کر جیسے انگڑائی لی تھی، ہر سمت دھوپ بکھر گئی تھی، لوگ اپنے اپنے کاروبار میں مصروف تھے، اسکول جانے والی بچیاں سرخ اور سبز رنگ کی یونیفارم میں اچھلتی کودتی جارہی تھیں، پہلے مجھے کچھ بھی سمجھ نہیں آیا، پھر میں نے اپنی بیٹی کو ایک ٹولی کے ساتھ جاتے دیکھا، بہت خوش ہوا اسے دیکھ کر، اس نے اس طرف نہیں دیکھا ورنہ وہ ہسپتال کی کھڑکی بند دیکھ کر سہم جاتی۔

''تم وہاں کیا دیکھ رہے ہو، کیوں کوئی لڑ رہا ہے'' بیڈ نمبر سات کا مریض مجھ سے مخاطب تھا۔

''نہیں'' میں نے کہا۔

''پھر کیا کوئی ایکسیڈنٹ ہوا ہے'' یہ کہہ کر اس نے اپنی ٹانگ کی طرف دیکھا جو کسی حادثے کا شکار ہو گئی تھی۔

''نہیں''

''پھر تم کیا دیکھ رہے ہو''

''دیکھ رہا ہوں کہ کس قدر گرم گرم دھوپ ہے باہر'' یہ سن کر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

بیڈ نمبر چار کا مریض تانبے کے خالی گلاس کی طرف دیکھ رہا تھا، میں جان گیا کہ آج بلی پھر اس کے حصے کا دودھ پی گئی ہے، اس کی آنکھوں میں شدید غصہ تھا، اس کا بس چلتا تو بلی کو زندہ دفنا دیتا لیکن ایسا کرنا اس کے لئے ممکن نہ تھا کیونکہ بلی روشن دان پر بیٹھی

تھی، اس کی گرفت سے بہت دور، اونچائی پر اور اونچائی سچائی ہے!

"مجھے اس بلی سے بے حد نفرت ہے" وہ بیڈ نمبر آٹھ کی طرف مخاطب ہو کر بول رہا تھا۔ "اور تم ہو ہر لمحہ بلی کو اپنے بستر پر بیٹھا کر پیار جتاتے رہتے ہو۔"

اور ہاں جس روز یہ بلی ہمارے وارڈ میں وارد ہوئی اس وقت شدید برف باری ہو رہی تھی۔ نمبر آٹھ درد سے چلا رہا تھا، دوا نہ لینے پر نرس سے لڑ پڑا تھا اور ہسپتال سے بھاگ گیا تھا۔ ہم سب پریشان ہو گئے کہ اس سردی میں نہ جانے کس چوراہے پر مر جائے گا، میں نے آہستہ سے رُک رُک کر اس کی بند کھڑکی کے پٹ کھول دیئے تھے مگر شام اُترنے سے پہلے ہی واپس چلا آیا۔ اس کی گود میں ایک بلی تھی، سفید سفید سی جنگلی بلی، بلی کو اپنے بستر پر بٹھا کر اس نے اپنے سرہانے کی کھڑکی بند کر لی اور مجھے ایک بار پھر اپنے آس پاس عجیب سی گھٹن کا احساس ہوا اور اس گھٹن میں کئی شب و روز گزر گئے، اب یہ بلی ہماری زندگی، ہمارے وارڈ کا ایک حصہ بن چکی تھی۔

بیڈ نمبر نو کے مریض کا آپریشن ہونے والا تھا، سارے وارڈ میں ایک خاموشی تھی، سانس لینے تک کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، شاید اس خاموشی اور اکتاہٹ سے بلی بھی تنگ آ چکی تھی لیکن اچانک اس نے ایک کروٹ لی، اپنے جسم کو سیکٹر اور پھر ایک چھلانگ لگائی اور ننگے فرش پر گھومنے پھرنے لگی، وہ جیسے ناچ رہی تھی، بے تحاشا، اپنے آپ سے بے خبر، اپنے وجود سے نا آشنا، دفعتاً چار نمبر ایک ہاتھی کی طرح اپنے بستر سے باہر آیا اور بلی کو دم سے پکڑ کر ننگے فرش پر دے مارا، صرف ایک چیخ سنائی دی!

"ناچ رہی تھی سالی" یہ کہہ کر وہ دوبارہ اپنے بستر میں گھس گیا، بلی گھبرا کر آٹھ نمبر کے پاس چلی گئی، وہ بے حد خوف زدہ لگ رہی تھی۔

رات کو عجیب بات ہوئی، سب سوئے ہوئے تھے، اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے میرے بستر پر کوئی بیٹھا ہوا ہے اور مجھے جگانے کی کوشش کر رہا ہے، میں خوف زدہ ہو گیا۔ میں نے رُک رُک کر اپنی آنکھیں کھولیں۔ بلی میری نظروں کے سامنے تھی، اس کی آنکھیں چنگاریوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ میں نے وارڈ کی طرف نظریں دوڑائیں، آٹھ نمبر ہانپ

رہا تھا، اس کی سانس اکھڑ رہی تھی، میں بستر سے اٹھا اور اس کے قریب چلا آیا، بلی ساتھ ساتھ چل رہی تھی، ڈاکٹر آیا اور بہت مشکل سے اس کی سانس درست ہوئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور بلی کے بارے میں پوچھنے لگا...... اور میں سوچنے لگا یہ بلی نہ ہوتی تو آٹھ نمبر مر چکا ہوتا!

سرہانے کی کھڑکی اب بھی بند ہے، بارش شاید برس کر تھم چکی ہے اگر میرے سرہانے کی کھڑکی بند نہ ہوتی تو میں بھی بارش سے دھلی ہوئی ہوا میں ایک سانس لیتا...... صرف ایک سانس!

ایک دن آٹھ نمبر میرے پاس آیا اور کہنے لگا...... ''ایک راز کی بات بتاؤں''

''ہاں ہاں ضرور'' میں نے کہا

''اب یہ چند دنوں کی مہمان ہے''

''کون'' میں نے حیران ہو کر پوچھا

''وہ'' اس نے بلی کی طرف اشارہ کیا'' کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ اس کی چال میں کس قدر لچک آگئی ہے۔ اسکی آنکھوں میں کتنا پیار امڈ آیا ہے۔''

''ہاں ہاں اس کا وزن بھی کچھ کچھ بڑھ گیا ہے''

''وہ ماں بننے والی ہے''

کئی دن بعد رات کو شور سنائی دیا، بلی کی میاؤں میاؤں کی آواز قریب سے ہی آرہی تھی، میری آنکھ کھل گئی، مجھے اپنے قریب ہی کوئی شے سُر سُر کرتی محسوس ہوئی۔ نمبر آٹھ میرے بستر کے قریب آکر کچھ تلاش کر رہا تھا۔

''کون ہے'' میں نے چلاتے ہوئے کہا۔

''میں ہوں'' مجھے آٹھ نمبر کی آواز سنائی دی

''تم میرے بستر میں کیا تلاش کر رہے ہو''

''کچھ بھی نہیں، بلی کے بچے ہوئے ہیں، اور ایک یہاں آپ کے بستر کے قریب ...... دیکھئے نا کس قدر نرم نرم اور گرم گرم ہے۔ ایک ساتھ تین بچے ہوئے ہیں...... تین......

ایک بہت اچھا شگون ہے۔"

اور پھر میاؤں میاؤں کے ساتھ سارا وارڈ مست نیند سے جاگ پڑا۔

بلی اچانک رونے لگ گئی۔ ایک عجیب سا درد تھا اس کے رونے میں...... اپنوں سے بچھڑنے کا درد، اپنوں کو کھونے کا غم...... "بلی کا رونا بُرا شگون ہے، بلی روتی ہے تو کوئی مرتا ہے کوئی چلایا۔

"سب مریضوں کو دیکھو۔ کوئی مر تو نہیں گیا...... اس بلی کو یہاں سے نکال دو"

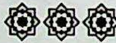
کوئی اور کہیے جا رہا تھا۔ اور پھر عجیب بات ہوئی چار نمبر آہستہ سے اپنے بستر سے نکلا، پہلے ادھر ادھر دیکھا جب کوئی چیز نہ ملی تو تانبے کا گلاس ہاتھ میں لے کر بلی کے قریب آیا اور اس کے سر پر دے مارا۔ بلی گھبرا گئی اور دروازے سے بھاگ گئی۔ رونے کی آوازیں بند ہوگئیں۔ اب وہاں بلی کے تین ننھے اور گرم گرم بچے تھے۔ وہ تینوں بچوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر اپنے بستر کے قریب آیا، شاید اس کے دل میں ان معصوموں کے لئے ہمدردی پیدا ہوئی تھی۔ پیار امڈ آیا تھا، اس نے اپنے سرہانے کی کھڑکی کھول دی اور اپنی آنکھیں بند کر کے تینوں بچوں کو کھڑکی سے باہر پھینکا، کھڑکی بند کی اور اپنے بستر میں لیٹ گیا۔ رات گئی بات گئی، صبح ہوئی، کل رات کیا ہوا کسی نے بھی زبان نہ کھولی، کوئی کچھ نہ بولا، ڈاکٹر آئے، چلے گئے، نرسیں آتی رہیں اور جاتی رہیں اور پھر نہ جانے کیسے رات کی کہانی نے ایک بار اور جنم لیا، ابھی شام اترنے میں دیر تھی کہ بلی لوٹ آئی، وہ جگہ خالی تھی جہاں وہ بچوں کو چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ وہ چاروں طرف تلاش کرنے لگی۔ دیوانی سی ہوگئی، چیخنے لگی، اس نے وارڈ کا گوشہ گوشہ دیکھا، ہر بیڈ کے پاس گئی، بستروں کو ہلاتی رہی، دیواروں کو کریدتی رہی...... آٹھ نمبر سے اس کی بے قراری اور بے بسی شاید برداشت نہ ہوسکی۔ وہ اپنے ہونٹ چباتے ہوئے خاموشی سے وارڈ سے باہر چلا گیا، وہ شاید رو رہا تھا۔ اس نے باہر جا کر پورے ہسپتال میں ان بچوں کو تلاش کیا۔ رات گئے وہ لوٹ آیا خالی ہاتھ جیسے اپنا سب کچھ لٹا کر آ رہا ہو...... مایوسی کی حالت میں اپنے بستر میں گھسنے سے پہلے اس نے اپنے سرہانے کی کھڑکی کھولنے کی کوشش کی مگر وہ کھل نہ سکی۔ آج نہ جانے وہ کیوں اپنی

کھڑکی کھول کر سونا چاہتا تھا......شاید روشنی کے لئے، ہوا کے لئے، زندگی کے لئے یا اس اُمید کے سہارے کہ وہ تینوں بچے اپنی ماں کے ساتھ اس کھڑکی سے لوٹ آئیں گے۔

پھر اس نے سر سے پیر تک اپنے سارے وجود کو چھپالیا!

لمحے گزرتے رہے، رات اُترتی رہی، سب سو گئے پھر اچانک بلی کے رونے کی آوازیں آنی شروع ہوگئیں۔ ان آوازوں نے سارے وارڈ کو ہلا کر رکھ دیا۔ سب جاگ پڑے تھے اور صبح کی روشنی کا انتظار کر رہے تھے۔ پو پھٹتے ہی چھ نمبر ڈرتے ڈرتے آٹھ نمبر کے پاس گیا، اس نے اس کے منہ سے چادر ہٹادی اور وہ کھلونا فرش پر گر پڑا، دائرے بکھر گئے اور وہ موتی جیسا سفید دانہ جانے کس گوشے میں گم ہوگیا...... ''یہ تو مر چکا ہے'' وہ چلا اٹھا۔

اور بلی چیخ رہی تھی، رو رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کاش میری کھڑکی کے دونوں پٹ پھر سے کھل سکتے، ذرا سی روشنی ہوتی اور میں ٹھیک سے سانس لے سکتا......!



رشتوں کا درد

جب رات کی خاموشیاں جاگ اٹھتی ہیں اور آنگن میں کھلے پھول مستی میں جھومتے خوابوں کی وادیوں میں کھو جاتے ہیں تو میں گھر لوٹتا ہوں، اپنے کمرے کا دروازہ کھولنے پر میری نظریں بے ساختہ گلی والی کھڑکی سے جاٹکراتی ہیں اور میں اس کے پٹ ایسے کھول دیتا ہوں جیسے رات کی حسینہ اپنی گہری سیاہ زلفوں کی مانگ میں یادوں بھری کہانیوں کی کہکشاں سنوار رہی ہو......!

یادوں بھری کہانیاں!

یوں تو میرے کمرے میں تین کھڑکیاں ہیں لیکن جو کھڑکی گلی کی طرف کھلتی ہے مجھے بہت پسند ہے، یہ کھڑکی میری ہم راز ہے اور اس پر لٹکے فاختائی رنگ کے پردے کی سرسراہٹ میں میرے دل کی دھڑکنوں کی دھیمی دھیمی سی آواز بھی شامل ہے لیکن آج میں یہ کھڑکی کھولنا نہیں چاہتا، میں تاروں بھری اس رات کی تاریکی میں اپنے دل کی دھڑکنوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سُلانا چاہتا ہوں تا کہ سامنے والی کھڑکی سے ابھرنے والی یہ نیم سریلی آوازیں اُن یادوں بھری کہانیوں کو میرے سامنے نہ دہرائیں جنہیں میں بھول جانا چاہتا ہوں۔

میں اپنا سیمیں بدن دودھ میں نہلاؤں گی
مجھے تیری محبت یاد آنے لگی
میں صندل کا پانی اپنے پر چھڑکوں گی
اے محبوب آ

میں اپنا سر تجھ پر قربان کروں......!

میں کبھی اِن گیتوں پر جان دیتا تھا اب اُنہیں سننا نہیں چاہتا اب مجھے اِن نیم سریلی آوازوں سے بھی نفرت ہو گئی ہے۔

''کھول دے یہ پٹ''

''نہیں نہیں آج مجھے ٹھنڈی تازہ ہوا کی ضرورت نہیں، آج میں اپنے بند کمرے میں گھٹ گھٹ کر رونا چاہتا ہوں، میں اپنی اُن ساری کہانیوں کو اپنے کمرے کی گھٹن میں دفن کرنا چاہتا ہوں تاکہ صبح کوئی نئی کہانی نہ جاگے، کسی نئی کہانی کا جنم نہ ہو میں نئی صبح کی دلہن کو اندھیاروں میں بیدار ہوتے نہیں دیکھ سکتا......!

اے میری ہم راز کھڑکی اس لڑکی پر رحم کر جس کی زندگی کی ساری تمنائیں لڑکپن کی ساری اُمنگیں اُن نیم سریلی آوازوں میں مچل رہی ہیں لیکن جو خود نہیں جانتی کہ اُسے کون پالکی میں بٹھا کر دور اجنبی وادیوں میں لے جا رہا ہے۔

کھول دے کھڑکی اور دیکھ اس پار والے مکان میں شادی کے کتنے ہنگامے ہیں، وہ دلہن بنی بیٹھی ہے، سرخ سرخ لبادے میں لپٹی چھوئی موئی سی دلہن اپنی آنکھوں میں انجانے محبوب کا تصور لئے اپنے دولہے کی منتظر، خوابوں کے شہزادے کے انتظار میں دودھ سے نہایا سیمیں بدن سرخ پھولوں اور گجروں سے سنوارا ہوا سراپا [illegible] شب عروسی کے سرخ جوڑے کے دامن میں جوہی اور ریحان کے کھلے ہوئے پھولوں کو پھیلائے ہوئے تصورِ جاناں کئے......!!

لیکن یہ سب ایک خواب ہے، ایک سپنا جو کبھی حقیقت کا روپ نہیں اپنا لیتا، کھڑکی پر لٹکے ہوئے فاختائی رنگ کے پردے میں ہلکی سی جنبش ہوئی اور مجھے محسوس ہوا جیسے میری ساری عمر کسی ان دیکھے خوابوں کے جزیرے میں ایک اجنبی سا خواب دیکھتے بیت چکی ہے!

ایک اجنبی سا خواب!!

''میں تمہارے خواب کی تعبیر ہوں، پھولوں کی خوشبو ہوں سنگیت کی لے ہوں''

میں آواز کی مٹھاس میں کھو گیا، میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنے دل کے

بجھے بجھے سے چراغ کی ٹمٹماتی لَو کو بچانے کے لئے اپنا ہی خونِ دل جلانے لگا اور وہ لمحہ جب میں نے اپنے خوابوں کو صنوبر کا روپ اپناتے دیکھا، گزر چکا ہے، خواب صرف خواب ہیں اور صنوبر ایک حقیقت، خواب جو کبھی حقیقت نہیں بنتے صرف ایک لمحہ آتا ہے اور گزر جاتا ہے اور اس لمحے کی یادیں ساری عمر کا روگ بن جاتی ہیں، میں بھی ایک روگی ہوں اور سامنے وہ چھوئی موئی سی دلہن بھی ایک روگی ہے۔

میں نے سوچا...... اس کا اپنا شیراز کنوارے خوابوں کا شہزادہ بن کر آئے گا اور اس کے بہار بھرے چمن میں پھولوں کی خوشبوئیں سونگھے گا، اس کے چاندنی سے بدن سے کھیلے گا، اس کے دودھ میں نہائے بدن کا لمس اُسے کندن بنا دے گا، لاج اور شرم سے جھکا ہوا سر اوپر اٹھائے گا اور پھر......!

ہر لڑکی اپنے محبوب کے بارے میں ایسا ہی سوچتی ہوگی۔ نہیں نہیں۔ ہر لڑکی اپنے محبوب کے بارے میں ایسا سوچتی تو کیا...... تو صنوبر نے میرے بارے میں ایسا کیوں نہ سوچا؟ اُس شام میں جھیل کے کنارے ایک انجان سی جگہ پر وائلن بجا رہا تھا میں بے حد اُداس تھا اور ایک دُھن کی تلاش میں تھا جس میں اپنی ساری اُداسیوں کو سمو سکوں۔ اچانک وائلن کے تار ٹوٹ گئے اور اُس کے ساتھ ہی کسی کے قدموں کی چاپ جاگی!

''آپ وائلن بہت اچھا بجاتے ہیں'' میں نے اپنی پلکیں اٹھا کر دیکھا، صندلی رنگ کا مرمریں جسم لئے ایک لڑکی کھڑی تھی اور اسے دیکھ کر محسوس ہوا جیسے میں ایک روح ہوں جو ازل سے ہی ایک ایسی ہی لڑکی کی تلاش میں اُداس ہو گئی ہو۔ وہ واپس مڑ گئی، ایک ہری بھری پشت پر نیچے جاتے جاتے سفید رنگ کا ریشمی فراک بے حد چُست ہو گیا تھا اور اس پر بھورے بالوں کے دو لمبے لمبے لٹ لہرا رہے تھے، مجھے اپنا سارا وجود بالوں کی گھٹاؤں میں گھرا محسوس ہوا...... میں نے اپنی پلکیں جھکا لیں۔

وہ اپنی سفید رنگ کی ماروتی کار میں بیٹھ کر چلی گئی لیکن درمیان میں ایک ایسی لکیر اُبھر آئی کہ میں رات گئے تک سوچتا رہا کہ کیا یہ لکیر کبھی مٹے گی۔

گھر آیا اور وائلن کے تار ٹھیک کرنے لگا، مجھے وقت کا کوئی احساس نہ رہا، ذہن

میں ایک ہی جملہ بار بار گونج رہا تھا ''آپ وائلن بہت اچھا بجاتے ہیں''

میں نے کھڑکی کھول دی اور گلی میں جو دو سائے نظر آئے اُنہیں پہچاننے میں دیر نہ لگی۔ ایک سایہ شیراز کا تھا اور دوسرا سایہ سلمیٰ کا۔ پھر دیکھتے دیکھتے ایک تیسرا سایہ نمودار ہوا، اس نے سلمیٰ کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑلیا اور اسے گھسیٹ کر لے گیا جیسے سلمیٰ لڑکی نہ ہو، چاول کی بوری ہو، یہ تیسرا سایہ جو ابھی ابھی نمودار ہوا تھا احمد دین کا تھا، احمد دین جو سلمیٰ کا باپ ہے......!

''میرے پھولوں کے متوالے ساجن آجا......''

''میں نے اِس لڑکی کو کئی بار دیکھا ہے'' میرے ایک دوست نے کہا تھا ''ہاں ہاں بقول تمہارے صندلی رنگ کی مرمریں جسم والی لڑکی، جانتے ہو کس کی بیٹی ہے، کہاں رہتی ہے، کہاں آتی جاتی ہے''؟

''جانتا تو کیوں پوچھتا''

''اس کا نام صنوبر ہے، وہ اے آر خان کی بیٹی ہے اور جھیل ہی کے کنارے سرکاری کوٹھی میں رہتی ہے''

''اے آر خاں، وہ آئی اے ایس جو......''

''جی ہاں''

دیکھتے دیکھتے وہ تیسرا سایہ بھی غائب ہو گیا، اس رات میں نے ایک بار پھر سپنا دیکھا، بس وہی سپنا...... میں جھیل کے کنارے وائلن بجا رہا ہوں اور صنوبر مست ہرنی کی طرح وائلن کی دُھنوں پر تھرک رہی ہے!

''بابر'' میرا سپنا ٹوٹ گیا، بھابھی کی آواز تھی۔

''جی بھابھی''

''تمہارے بھائی کہہ رہے تھے کہ احمد دین نے کل رات سلمیٰ کو اس قدر پیٹا ہے کہ اُس کے سارے جسم پر داغ پڑ گئے ہیں، احمد دین کی عزت مٹی میں مل گئی......''

''بھابھی!'' میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''بھابھی یہ سب جھوٹ ہے، وہ ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں، پیار کرنا جرم نہیں، بھابھی میں آپ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اُن کی محبت پاک ہے''۔

تم کیسے جانتے ہو''

''میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، کئی بار دیکھا ہے، اُن کی باتیں سُنی ہیں، آپ بھیا کو کہہ دیجئے کہ وہ احمد دین سے سلمیٰ اور شیراز کی شادی کی بات کریں''

کیسی عجیب بات ہے، کیسی عجیب دنیا ہے، کیسے عجیب لوگ ہیں، یہاں گلیوں میں ملنے والے دو پریموں کا مقدس اور پاکیزہ پیار رسوا ہو جاتا ہے اور وہاں فرش مرمر پر ملنے والوں کے گناہ اور ثواب کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں......!

''ویٹر''

''سر''

''ایک بلیک اینڈ وہائٹ''

''ایک بئیر''

''دو کپ کافی''

میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں اچانک زندگی کے آثار ایک ساتھ جاگ پڑے، آکسٹرا پر کوئی سریلی دُھن چھڑ گئی تھی اور فرشِ مرمر پر جوان جسم ناچ رہے تھے......

دروازے سے ابھی ابھی داخل ہونے والی صنوبر گوشے والی میز پر ایسے بیٹھی تھی جیسے سنگِ مرمر کے حوض میں گل دوپہر کا پھول کھلا ہو...... بے داغ پھول!!

یہاں کی دنیا جاگ رہی ہے اور باہر کی دنیا سو رہی ہے۔

ایک یہ ہے جو سنگ مرمر کے محل میں موتیوں کی مالا پرو رہی ہے، ایک وہ ہے جو آنسوؤں کی مالا پرو رہی ہوگی......

صنوبر!

سلمیٰ!

''صاحب! وہ میم صاب آپ کو یاد کرتی ہیں''

''مجھے''میں نے بے ساختہ صنوبر کی طرف دیکھا، وہ مسکرا رہی تھی۔

اُس نے ایک بار پھر وائلن بجانے کی بات چھیڑ دی...... ''وائلن آپ واقعی بہت اچھا بجاتے ہیں''۔

''کوشش کرتا ہوں''

''جی نہیں میں تو اس شام بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گئی''

''شکر ہے کہ وائلن کے تار ٹوٹ گئے تھے، ورنہ آپ شاید واقعی......''

وہ مسکرا دی اور میں نے جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

کافی پینے کے بعد وہ چلنے لگی...... ''آپ ابھی ٹھہریں گے؟''

''جی نہیں، میں بھی جانا چاہتا ہوں'' ہم باہر آ گئے، سفید ماروتی اس کی منتظر تھی۔

''آپ کو کہاں جانا ہے''

''جھیل کے کنارے......''

''تو آیئے وہاں تک میں آپ کا ساتھ دوگی''

''اور اُس کے بعد......'' بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا، وہ مسکرا دی اور پھر میری طرف ایسے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو...... ''تیرا میرا تو جنم جنم کا ساتھ ہے، میں تو ازل ازل سے تمہارے تلاش میں بھٹک رہی ہوں، میں تمہارے سنگیت کی لے ہوں، ساز کی آواز ہوں، تمہارے وائلن پر اُبھرنے والی دُھن ہوں، نغمہ ہوں......!''

اور میں نے اطمینان کا سانس لیا!

''بھیا اُس کا من ہوتا، دل اور دل کی دھڑکنیں ہوتیں تو وہ اپنی بیٹی کا سودا نہ کرتا''

''سودا یہ تم کیا کہہ رہے ہو بابر!''

''بھیا میں ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں، من نام ہے ضمیر کا، محبت کا، شرافت کا اور احمد دین کے پاس ان میں سے کوئی شئے نہیں، وہ بھوکا ہے''۔

''وہ بھوکا ہے'' کیا مطلب؟

''وہ پیٹ کا بھوکا ہے اور یہ بھوک سلمٰی کی شادی کرنے سے مٹ سکتی ہے، ورنہ وہ

جانتا ہے کہ سلمیٰ شبنم کے قطروں کی طرح پاک ہے اور شیراز اسے دل کی گہرائیوں سے پیار کرتا ہے لیکن شیراز غریب ہے اور احمد دین کو روپیوں کی ضرورت ہے"۔

"بابر"

"ہاں بھیا! دراصل اس کا بھی کوئی قصور نہیں، ہم سب کو اچھے مکان، اچھے کپڑوں اور اچھی خوراک کی ضرورت ہے، ہم اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے دوسرے کو قربانی کا بکرا بناتے ہیں"

"کل ہمارے ہاں نئے سال کی پارٹی ہے، آپ بھی آیئے گا اور......"

"اور کیا......"

"اپنا وائلن بھی ساتھ لایئے گا، میں آپ کا انتظار کروں گی، آئیں گے نا آپ......"

سنگِ مرمر کا ہوٹل ہو یا گلابی رنگ ڈرائینگ روم، ایک جیسی دنیا ہے،، ایک جیسا ماحول ہے، ایک جیسی باتیں ہیں، ایک جیسے لوگ ہیں، وہاں بھی شراب کے جام میں دنیا بستی ہے اور یہاں بھی......بس فرق اتنا ہے کہ وہاں لوگ نقلی چہرے لگا کر آتے ہیں اور کلچر کی باتیں کرتے ہیں یہاں نقلی چہرے اتر جاتے ہیں اور اصلی چہرہ وجود میں آجاتا ہے، بہکے بہکے لوگ، بہکی بہکی باتیں، بہکی بہکی بیویاں اور ایسی ہی دنیا میں صنوبر تھی، اس کی آنکھوں میں عجیب سی مستی تھی، عجیب سی بے قراری تھی......!

ٹِک، ٹِک، ٹِک،!

Happy new Year to You

نیا سال مبارک ہو......ملی جلی آوازیں ایک ساتھ فضا میں گونجیں اور اس کے ساتھ یہ ساری روشنیاں بجھ گئیں، صرف سانسوں کی آوازیں سنائی دیں، میں نے اسی تاریکی میں سانسوں کے اسی مدوجزر میں اپنا وائلن اٹھایا اور دھن چھیڑ دی!

جب جواں دل دھڑکتے ہیں

تارے لرزتے ہیں

رات مُرجھا جاتی ہے

محبت کا دیوتا ہنستا ہے

کاش فرشتے بھی محبت کر سکتے!

دفعتاً بجلی کے قمقموں میں روشنی لوٹ آئی اور میں نے صنوبر کو ایک نوجوان کی آغوش میں دیکھا، میرے وائلن کے تار ٹوٹ گئے، میرا ہاتھ بری طرح زخمی ہوا، میری انگلیوں سے خون بہنے لگا، کچھ دن بعد میرا ہاتھ بالکل ٹھیک ہو گیا مگر ڈاکٹر نے کہا کہ اب یہ انگلیاں کبھی وائلن کے تاروں کو نہ چھیڑ سکیں گی، وہ نغمہ ڈوب چکا تھا جو دلوں کو ملاتا ہے......!!

آخر یہ دل بھلا کس شئے کا نام ہے!

دل اور محبت کا کیا رشتہ ہے آپس میں!!

یہ ابھی ابھی میرے گھر آنے سے پہلے کی بات ہے، صنوبر کے ہاں پارٹی تھی، اس کے باپ اے۔آر۔خان نے مسکراتے ہوئے کہا......"آج کی یہ پارٹی صنوبر اور لیاقت کی شادی کی ابتداء ہے، اب میں ریٹائر ہو رہا ہوں، لیاقت کو آپ جانتے ہیں، خواجہ عبدالصمد کے اکلوتے بیٹے ہیں، اُن کا لاکھوں کا کاروبار ہے، مجھے اس ملاپ پر مسرت ہو رہی ہے......"

"آپ کا وائلن کہاں ہے......"

"میرے وائلن کے تار ٹوٹ چکے ہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے"

"وہ وائلن مجھے دیجئے نا"

"آپ کو دے دوں تو میرے پاس کیا رہے گا"

"عجیب فلسفہ ہے......" لیاقت نے کہا۔

"آؤ ڈارلنگ ہم مل کر اپنے دل کے وائلن پر ایک نئے نغمے کی تخلیق کریں گے"۔

"نہیں لیاقت مجھے وائلن چاہیے"

"بس وائلن کی ہی بات ہے، کل ایک درجن لے آؤں گا"

''مجھے صرف بابر کا وائلن چاہئے''

''اس کے تو تار بھی ٹوٹ چکے ہیں'' میں نے کہا۔

''ٹوٹنے دیجئے مجھے ہر قیمت پر بس بابر کا ہی وائلن چاہئے''

''تو لے لو نا اس کی قیمت دے دیں گے''

''لیاقت صاحب! آپ زندگی میں ہر شئے پیسوں سے خریدنے کے عادی ہیں، اس سے بڑھ کر بھی کوئی چیز ہوتی ہے''۔

''کوئی چیز، میں تمہارا وائلن خریدنا چاہتا ہوں، کتنی قیمت چاہئے، ہزار، دس ہزار، پچاس ہزار......''

اور وہ صنوبر کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر چلا گیا!

''میرے پھولوں کے متوالے ساجن آجا......''

تصدیق کی جاتی ہے کہ شوکت احمد جس کی شادی سلمیٰ دختر احمد دین سے طے ہوئی ہے نکاح خوانی سے پہلے احمد دین کو تیس ہزار روپئے نقد ادا کرے گا اور دو سال تک ہر ماہ تین سو روپئے ادا کرتا رہے گا......!

یہ تحریر مجھ سے سنی نہیں جاتی

''شوکت احمد آپ کو منظور ہے''

''منظور ہے''

اور سلمیٰ بی بی

کوئی آواز نہیں اور اس خاموشی کے ساتھ ایک ہنگامہ بپا ہوا، احمد دین غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔

''یہ شادی ہوگی، لڑکی ہاں کرے یا نا......'' احمد دین چلا اٹھا۔

''ٹھہرو......'' میں چلا اٹھا، ایک لمحے کے لئے ہر طرف سکوت چھا گیا، سلمیٰ کی شادی شوکت سے نہیں، بلکہ شیراز سے ہوگی، صرف شیراز سے اور احمد دین تم کو تمہاری رقم مل جائے گی میں شیراز کی طرف سے تمہیں یہ رقم دینے کے لئے تیار ہوں......''

''تمہارے پاس یہ رقم کہاں سے آئے گی بابر! تیس ہزار روپئے بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔ تمہیں احساس ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو''؟

''بھائی میں جانتا ہوں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں''

''اور یہ رقم''

''میں اپنا وائلن کسی کو دے کر یہ رقم حاصل کروں گا، مجھے صرف آج رات کی مہلت چاہیے''۔

میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھول دی ہے۔ احمد دین کے مکان میں اب کوئی ہنگامہ نہیں، کوئی شور نہیں، صرف دو نیلی آنکھیں گلی میں جھانکتی نظر آرہی ہیں، یہ سلمیٰ کی آنکھیں ہیں جنہیں شیراز کا انتظار ہے......!!

میرے پھولوں کے متوالے ساجن آجا......!!!۔



ریڈیائی ڈرامے

ثاقب اور افراح کے لئے

میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

ریڈیو ڈرامہ

کردار/آوازیں

۱۔امراؤ بیگم
۲۔مرزا غالب
۳۔ضیاء الدین
۴۔کلو میاں
۵۔راوی
۶۔تین مردانہ آوازیں

میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

موسیقی کی ایک اُداس لہر اُبھرتی ہے اور ڈوب جاتی ہے، پھر بادلوں کی ہلکی سی گڑگڑاہٹ......اور یکدم خاموش......کافی دور سے اذان کی آواز ابھرتی ہے......اللہ اکبر......اللہ اکبر......اور پھر ایک سناٹا سا چھا جاتا ہے اور اس سناٹے کے پس منظر میں ایک آواز ابھرتی ہے اور ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہے......یہ آواز مرزا غالب کی ہے......

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز......میں ہوں اپنی شکست کی آواز

(موسیقی کی ایک لہر)............

راوی: سن ۱۸۶۹ء......۳ فروری کی شام......گلی قاسم جان خاموشیوں میں ڈوب چکی ہے (آہ بھر کر) شام کے پھیلتے سائے اپنی تاریک زبانیں کھولے در و دیوار سے روشنی کی آخری کرنوں کو چاٹنے کے لئے لپک رہے ہیں......آسمان پر سیاہ گھنے بادل (بادلوں کی ہلکی گرج) دور افق کے مغربی کونے سے پھیلی ہوئی شفق کچھ اس انداز سے اپنا سرخ آنچل سمیٹ رہی ہے گویا سیاہی کے ان پھیلتے ہوئے دھبوں سے اسے داغدار نہیں کرنا چاہتی......ڈوبتے سورج کی باقی ماندہ کرنیں گلی قاسم جان کی ایک اُداس اور مغموم حویلی میں چند لمحے ستانے کے لئے رک سی گئی ہیں......حویلی کے صحن میں ایک بہتر ۷۲ سالہ عورت ٹہل رہی ہے......!

(صحن میں تھکے تھکے قدموں کی چاپ......اور ساتھ ہی چھڑی ٹپکنے کی

آواز جو کبھی قریب اور کبھی دور ہو جاتی ہے)

راوی: (آہ بھر کر) یہ بہتر سالہ عورت امراؤ بیگم ہے۔ ہاں امراؤ بیگم...... مرحوم الٰہی بخش معروف کی بیٹی، دلی کے نواب فخر والدین کی بھتیجی اور ہندوستان کے مایہ ناز شاعر مرزا اسد اللہ خان غالبؔ کی رفیقِ حیات...... (ہلکی ہلکی موسیقی کی لہر)...... مرزا غالبؔ ایک سال قبل اپنی رفیقۂ حیات کو اس بے رحم دنیا میں اکیلا تنہا چھوڑ کر ایک ایسی دنیا اپنا چکا ہے جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا......

(ہلکی موسیقی میں ابھرتی ہوئی چھڑی ٹیکنے کی آواز جو مائیک کے قریب آ کر رُخ جاتی ہے)

راوی: امراؤ بیگم چلتے چلتے رک گئی ہے...... (آہ بھر کر) جانے کیا سوچ رہی ہے...... کن خیالوں میں ڈوب چکی ہے......

(خاموشی)

امراؤ بیگم: (کانپتی ہوئی آواز) میرے مولا جانے تجھے کیا منظور ہے، جان جاتے رہ جاتی ہے...... اس ضعیف و ناتواں کو اب اور کتنے دکھ دے گا...... کب بلائے گا تو مجھے اپنے پاس (آہ بھر کر) سانسوں کا یہ زہراب اور نہیں پیا جا سکتا۔

(دور سے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز)

امراؤ: (سہمی ہوئی آواز میں) کون......؟ کلو میاں...... نہیں وہ نہیں ہوگا...... اُسے گئے ہوئے تو ابھی...... شاید کوئی اور ہوگا......

(دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز)

ضیاء الدین: (دور سے) کلو میاں...... امراؤ آپا...... کلو میاں...... آنگن کا دروازہ تو کھلا ہی ہے...... (قدموں کی آواز)...... اُف یہاں کتنا اندھیرا ہے اللہ خیر کرے، رات ہونے کی آئی...... گھر میں دیا نہ بتی (آواز دیتے

ہوئے) آپا......امراؤ آپا (کسی کے گرنے کی آواز)......کون (گھبراتے ہوئے لہجے میں) امراؤ آپا......آپ یہاں کیا کر رہی ہیں کلو کہاں جا مرا ہے......

امراؤ: (آواز سنبھالتے ہوئے) پاؤں پھسل گیا ضیا......

ضیاء الدین: آپا کتنی بار منت سماجت کی یہ ویران حویلی چھوڑ کر میرے پاس چلیں جو روکھی سوکھی ہم کھاتے ہیں آپ بھی کھالیں......لیکن آپ راضی ہوں تو......بس ایک ہی ضد......جب تک جیوں گی یہاں سے نہ جاؤں گی......خدا جانے اس ضد میں کیا تک ہے......اس قدر تنہائی اتنی تاریکی......نہ دیا نہ لو۔

امراؤ: دیا طاقچے میں پڑا ہے ضیا......گھر میں دیا سلائی نہ تھی کلو بازار گیا ہے لینے۔

ضیا: اٹھو آپا......(گھبرائے ہوئے لہجے میں) میرے خدا......اندر چلیں آپا آپ کا جسم کس قدر سرد ہو گیا ہے۔

(چلنے کی آواز......وقفہ......دیا سلائی جلانے کی آواز)

امراؤ: اللہ میاں کو نجانے کیا منظور ہے سانس کی ڈوری ہے کہ ٹوٹنے میں نہیں آتی (وقفہ) وہ مجھ سے دو برس قبل آئے اور ایک برس ہو گیا انہیں یہ دنیا چھوڑے......(رک کر) میں نے اور کب تک جینا ہے۔ضیاء الدین کیا رہ گیا ہے جوان آنکھوں کو ابھی دیکھنا ہے......ابھی اور کتنا جینا پڑے گا مجھے......

ضیاالدین: اب کی بار آپ کی ایک نہ سنوں گا......اب تو آپ کو میرے ساتھ......

(دور سے اللہ اکبر کی صدا گونجتی ہے)

امراؤ: (بات کاٹتے ہوئے) نماز کا وقت ہو گیا ضیا......اب تم جاؤ

ضیا: نہیں......کلو میاں کو آنے دیجئے......آپ نماز ادا کریں۔

امراؤ: اچھا......

(......وقفہ......ہلکی ہلکی موسیقی ابھرتی ہے)

ضیا: (اپنے آپ سے)......آپا میرے تاؤ مرحوم کی لاڈلی بیٹی......میرے اُستادِ محترم کی بیوہ......خداوند کیا آدمی تھے مرزا بھی......کس قدر دشوار تھا اُن کا ہم سفر بننا خدا نے انہیں ذوق گناہ تو دیا لیکن اس کی ترسیل کے لئے سامان فراہم نہ کئے۔ نظر تو دی لیکن نظروں پر پابندی لگادی۔ تخیل کی بلندی تو عطا فرمائی لیکن اس کی پرواز کو کون ومکان کی حدوں میں مقید کر دیا......میری آپا......آپ ہی تھیں جس نے اس آتش نفس انسان کے ساتھ عمر نبھالی ورنہ......

(دور سے غالب کی آواز ابھرتی ہے......گنبد کی آواز کی مانند)

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی......

(غالب کی آواز فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے......)

(......وقفہ......)

ضیا: وہ لڑکی جس کے نزدیک زندگی صرف بہاروں کی تازگی، پھولوں کی مہک، قوس وقزح کی طرح رنگین اور چاہتوں کی آغوش تھی وہ معصوم دوشیزہ عروسی جوڑے میں ملبوس ایک شاعر کی زندگی میں وارد ہوئی......

(خوشی اور مسرت سے بھرپور موسیقی)

غالب کی آواز: رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوامِ جس صادر ہوا، ایک بیڑی پاؤں میں ڈالی گئی، دلی شہر کو زندان مقرر کیا گیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا گیا۔

(نسوانی قہقہے ابھرتے ہیں)

امراؤ: (جوان آواز) وہ شاعر ہیں۔

شاعر بنا کسی مقصد کے زندگی کی وادیوں میں گھومتے پھرتے ہیں، جو

راوی: لوگ انہیں رہنما سمجھ کر ان کی پیروی کرتے ہیں وہ گمراہ ہو جاتے ہیں، جن کی اپنی کوئی منزل نہ ہو بھلا دوسروں کو کیسے منزل مقصود تک پہنچائیں گے۔

امراؤ: (جوان آواز) (سوچتے ہوئے) شاعر تو ابا حضور بھی ہیں لیکن ان کا بڑا رتبہ ہے، عزت ہے، گھر ہے، وہ ہم سب سے کتنی محبت کرتے ہیں، ابا حضور تو کہا کرتے ہیں شاعر فرشتہ ہوتا ہے جو دنیا کے لوگوں کو جینے کا سلیقہ سکھاتا ہے (ہنستی ہے) پر میرے میاں تو......وہ تو......وہ تو......

غالب:
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

امراؤ: لیکن حضرت زندگی کچھ اور بھی چاہتی ہے، کچھ اور بھی تقاضے کرتی ہے

غالب: (ہنستے ہوئے) کیا چاہتی ہے زندگی......عیش و عشرت

امراؤ: (ہنستے ہوئے) میں عیش و عشرت کا تقاضہ نہیں کر رہی میرے حضور۔

غالب: کمال ہے......تو پھر کیا چاہتی ہو بیگم

امراؤ: صرف ایک گھر

غالب: گھر (ہنستا ہے) یہ ساری کائنات ہی تو ہمارا گھر ہے......میں چاہتا ہوں کہ......

امراؤ: (بات کاٹتے ہوئے) کیا......کہیے نا......خاموش کیوں ہو گئے۔

غالب:
رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو!

امراؤ: میری بات یوں نہ ٹالیۓ......

غالب: گھر......ہاں گھر......

بے در و دیوار سا اک گھر بنانا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

امراؤ: مجھے سچ مچ ایک مکان چاہئے۔

غالب: تمہارا مطلب ہے ایک حویلی۔

امراؤ: نہیں حضرت مجھے حویلی نہیں ایک گھر چاہئے ایک پُر مسرت ازدواجی زندگی (خیالوں میں ڈوب کر) ایک صاف ستھرے مکان میں سجا سنورا گھرانہ جس کے آنگن میں ننھے ننھے بچے کلکاریاں مارتے پھریں جس کا گوشہ گوشہ عودوعنبر کی خوشبو میں بسا ہوا ہو۔ جس کی صبحیں اور شامیں پاک وصاف ہوں مقدس ہوں۔

غالب: امراؤ میرا اندازہ غلط نکلا تم تو اس دنیا کی ان لاکھوں عورتوں میں سے ہو جو اپنے شوہر کو گھر کی چار دیواری میں جکڑے رکھنا چاہتی ہیں۔ لیکن بیگم (ذرا رک کر) میرے قدموں کو تو نئی راہوں کی تلاش ہے میں تو پرواز کرنا چاہتا ہوں۔ نہیں نہیں میں اس جال میں نہیں پھنسوں گا ؎

مانعِ دشت نوردی کرنی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے میرے پاؤں میں زنجیر نہیں......!

(بوتل اور گلاس ٹکرانے کی آواز)

امراؤ: (غصہ بھرا لہجہ)......شراب، قمار بازی، آوارگی (سسکتے ہوئے) میں اس زندگی سے تنگ آچکی ہوں مرزا......خدا کے لئے یہ سب چھوڑ دو (روتے ہوئے) ورنہ......ورنہ یہ گھر اجڑ جائے گا۔

غالب: (لڑکھڑاتی آواز میں) ؎

مئے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے

امراؤ: (سسکتے ہوئے) میرے خدا مجھے اس دنیا سے اٹھالے......یہاں تو صبح تا شام قرض خواہوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ عزیز رشتہ دار ہنسی اُڑاتے ہیں اپنے لوگ ملنے سے کتراتے ہیں......آخر یہ سب کچھ کہاں تک

چلے گا...... (قدموں کی آواز...... آہستہ آہستہ دور ہوتی جاتی ہے) آخر کب تک ادھار کی پیتے رہو گے، یہ قرض کون چکائے گا...... کون ادا کرے گا اتنی رقم۔

غالب: ؎ ہم کو ان سے ہے وفا کی امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

(موسیقی پھر تیز ہو کر فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے)

......دور سے دروازہ کھلنے کی آواز اور پھر کلو میاں کے گنگنانے کی آواز

کلو میاں: (گنگناتے ہوئے) ؎
ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

ضیا: (اونچی آواز میں) کون؟

کلو: (قریب آکر) میں ہوں حضور

ضیا: تم......کلو میاں تم

کلو: آداب بجالاتا ہوں

ضیا: (غصے سے) اتنا دیر کہاں رہے کلو میاں، تمہیں اتنا بھی خیال نہیں کہ آپا گھر میں تنہا ہیں۔

کلو: غلطی ہو گئی حضور...... ابھی حاضر ہوتا ہوں، ذرا مرزا صاحب کے کمرے میں چراغ جلا آؤں۔

(وقفہ)

امراؤ: (بوڑھی آواز میں) تم ابھی گئے نہیں ضیا...... کلو نہیں آیا۔

ضیا: کلو آ گیا ہے (ذرا رک کر) آپا آج کوئی قرض مانگنے تو نہیں آیا۔

امراؤ: نہیں (آہ بھر کر) میں نے نواب رام پور کو بھی خط لکھا تھا۔

ضیا: خط (حیرانگی کے ساتھ) خط نواب صاحب کو

امراؤ: ہاں مجھے لکھنا ہی پڑا...... کیا کروں جب سے وہ وفات پا گئے ہیں میں اَن گنت مصیبتوں میں پھنس گئی ہوں...... مرزا صاحب مرحوم آٹھ سو روپئے کے قرض دار مرے اس پر مصیبت یہ کہ انگریزوں کی پنشن مسدود ہوئی۔ انگریز کا حکم ہے کہ مجھے دس روپئے ماہانہ پنشن تب ہی مل سکتی ہے جب میں کچہری میں حاضر ہو جاؤں لیکن جانا میرا کچہری ہرگز نہ ہوگا کیا میں اپنے باپ چاچا اور شوہر کا نام اس طرح روشن کروں...... یہی باتیں میں نے نواب رام پور کو بھی لکھی تھیں۔

ضیا: میں کس قدر شرمندہ ہوں لیکن آپا...... اب کوئی قرض مانگنے والا یہاں نہیں آئے گا اب تمہیں کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلانا پڑے گا، میں نے سب کا حساب بے باک کر دیا ہے۔

امراؤ: ضیا...... ضیال الدین...... اب میں آرام سے مر سکوں گی میرے بھائی...... تم نے قرض چکا کر ایک نیک کام کیا ہے...... اللہ تمہیں اس کا اجر دے گا...... مرزا صاحب کی وفات کے بعد تم نے جس قدر پرورش کی ہے اس بوڑھیا کی...... وہ میں جانتی ہوں اور میرا خدا......

ضیا: شرمندہ نہ کرو...... میں اب چلتا ہوں...... تم بھی آرام کرو صبح آؤں گا لینے کے لئے...... تیار رہنا (آہ بھر کر) مجھے دکھ ہے کہ میرے استادِ محترم اور میرے بہنوئی کی بیوہ اس سنسان گھر میں زندگی کے دن پوری کر رہی ہے لیکن اب میں آپ کو یہاں نہیں رہنے دوں گا...... کل سویرے سواری لے کر آؤں گا...... اچھا بہن...... خدا حافظ

امراؤ: جیتے رہو

(قدموں کی چاپ اور پھر کلو میاں کے گنگنانے آواز)

ضیا: (چلتے چلتے رک کر) یہی وہ کمرہ ہے جہاں مرزا نے اپنی زندگی کے آخری ایام بسر کیے (آہ بھر کر) وہی پلنگ، وہی میز، میز پر پڑا قلم

دان، مئے کی بوتل نصف بھری ہوئی ایک گلاس، کچھ کتابیں اور کاغذات...... اس کمرے کی فضا میں آج بھی ان مقدس سانسوں کی آواز سنی جاسکتی ہے...... مجھے یاد آرہا ہے سب کچھ یاد آرہا ہے......
(پس منظر میں قہقہوں کی آواز) کون کہتا ہے کہ مرزا اس دنیا میں نہیں، اگر وہ نہیں ہے تو کمرے کی درودیوار سے یہ کیسی آواز آرہی ہے...... یہ دوستوں اور شاگردوں کے درمیاں کون باتیں کر رہا ہے۔

غالب کی آواز: وبا آئی ہی کہاں تھی، مجھے تو کوئی علمیت ہی نہیں...... ایک چھیاسٹھ سال کا مرد اور ایک چونسٹھ برس کی عورت...... ان دونوں میں سے ایک بھی مرتا تو ہم جانتے کہ وبا آئی تھی۔
(قہقہے)

ضیا: (خیالوں میں ڈوبے ہوئے) وبا

غالب کی آواز: میں نے کہا میں تو آدھا مسلمان ہوں، شراب پیتا ہوں، سور نہیں کھاتا۔
(قہقہے)

ضیا: آدھا مسلمان

غالب کی آواز: میں نے پوچھا آخر شراب میں کون سی خرابی ہے، حضرت فرمانے لگے شرابی کی دعا مقبول نہیں ہوتی...... ارے بھائی ذرا یہ تو بتاؤ جس کے پاس شراب موجود ہے اس کم بخت کو اور کون سی دعا کی ضرورت ہے۔
(قہقہے)

ضیا: یہ تو ان کی ہی آواز ہے...... مرزا صاحب کی آواز

غالب: حضرت میں آپ کو جوتا دکھانے کے لئے شمع دان لے کر نہیں آیا ہوں بلکہ میں تو اس لئے آیا ہوں کہ کہیں آپ میرا جوتا نہ لے جائیں۔
(قہقہے)

ضیا: یہ زندہ دل آواز جانے کن تاریکیوں میں ڈوب گئی۔

غالب (آواز ابھرتی ہے)

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

ضیا: (دور جاتے ہوئے) شمع ہر رنگ میں جلتی ہے...... ہاں شمع ہر رنگ میں جلتی ہے مرزا کی جوانی بھی کیا جوانی تھی۔ مشاعرے، شعروشاعری شراب اور وہ...... وہ ڈومنی کس ادا اور کس نزاکت اور نفاست سے غالب کے شعروں میں جان ڈالتی تھی

زنانہ آواز: (سریلی آواز)

کھلتا کس پر کیوں میرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

ضیا: ایک وہ تھی اور ایک امراؤ بیگم ہے مرزا مرحوم کی رفیقہ حیات جو مرزا مرحوم کی وفات تک گھر میں اکیلی رہتی تھی اپنے خاوند کی راہ تکتی تھی اور سوچتی رہتی تھی کہ اس کے مرد کو باہر کی دنیا سے اس قدر پیار کیوں ہے کیوں وہ دن رات باہر رہتے ہیں۔

(......وقفہ......)

(ہلکی ہلکی بارش برسنے کی آواز۔ دور کوئی کتا بھونکتا ہے)

امراؤ: (تھکی ہوئی آواز) تم ابھی سوئے نہیں کلو

کلو: بہت ٹھنڈ ہے...... آپ کے لئے انگیٹھی سلگا دوں۔

امراؤ: نہیں......

کلو: بیگم صاحبہ

امراؤ: کہو کلو میاں۔

کلو: بازار سے ڈبیا لے کر آرہا تھا کہ ایک صاحب مل گئے......

امراؤ: کون

کلو: میں نہیں جانتا لیکن وہ مجھے جانتے تھے (رک کر) مرحوم مرزا پر کتاب لکھ رہے ہیں۔ اپنے گھر لے گئے، خوب خاطر کی...... پھر مرزا صاحب کی زندگی کے بارے میں پوچھنے لگے......

امراؤ: کیا

کلو: یہی کہ مرزا صاحب شعر کب کہتے تھے، ان کی خوراک کیا تھی، شراب کب پیتے تھے......اور......اور بیگم صاحبہ...... کہنے لگے کہ مرزا صاحب کی بیگم......یعنی آپ......آپ جھگڑالو ہیں...... میں نے کہا یہ سب جھوٹ ہے تب وہ ایک کتاب لے آئے اور مرزا مرحوم کے خطوط سے اقتباسات سنانے لگے، پہلے انہوں نے وہ خط پڑھا جو مرحوم نے ہرگوپال تفتہ کو امراؤ سنگھ کی دوسری بیوی کی وفات پر لکھا تھا۔

امراؤ: کون سا خط

غالب کی آواز: امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آیا، اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو بار اُن کی بیڑیاں کٹ چکیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے نہ پھندہ ہی ٹوٹتا ہے اور نہ دم نکلتا ہے۔

کلو میاں: میں نے سمجھایا کہ مرزا صاحب بڑے مزاحیہ مزاج کے مالک تھے، بات میں سے بات نکالنے کا فن انہیں خوب آتا تھا، خط میں پھانسی کے پھندے کی بات مذاق میں لکھی ہوگی تب اس نے ایک اور خط پڑھ کر سنایا۔

غالب کی آواز: ہر شخص کو غم موافق اس کی طبیعت کی ہوتی ہے ایک تنہائی سے نفور ہے ایک کو تنہائی منظور ہے...... میں کبھی اس بندھن سے خوش نہ ہوا لوہے کا ایک طوق ہے گلے میں پڑا ہوا۔

امراؤ: ہاں گلے کا طوق...... پھانسی کا پھندہ۔

کلو: یہ خط سن کر میں خاموش ہو گیا...... میں سمجھ گیا کہ وہ آدمی بہت کچھ جانتا ہے (آہ بھرتا ہے) اور پھر...... اور پھر کہنے لگا کہ مرزا مرحوم ایک ڈومنی سے پیار کرتے تھے۔ اور...... اور......

امراؤ: اب سو جاؤ کلو میاں

کلو: کھانا لے آؤں بیگم صاحبہ

امراؤ: نہیں مجھے بھوک نہیں ہے تم جا کر کھالو اور آرام کرو......

(......وقفہ......)

......زور زور سے آندھی چلنے کی آواز......

......بادل کی گن گرج......

کلو: (دور سے) نینداس کی ہے راتیں اس کی ہے دماغ اس کا ہے
جس کے شانوں پر تیری زلفیں پریشاں ہو گئیں......!

امراؤ بیگم: (اپنے آپ سے) نینداس کی ہے...... راتیں اس کی ہیں۔

کلو: (دور سے) رات گئے جب مرزاؔ مرحوم گھر لوٹ آتے تھے تو اکثر یہی شعر گنگناتے تھے......

(......وقفہ...... آندھی کا شور......)

امراؤ: (اپنے آپ سے) جانے مرزاؔ نے یہ شعر کس کے لئے کہا تھا...... میرے لئے...... نہیں میں جانتی ہوں کہ یہ شعر انہوں نے ڈومنی کے لئے لکھا تھا جسے مرزا جوانی کے دنوں میں عشق کرتے تھے اور زندگی بھر اس کی یاد بھلا نہ سکے۔

(پس منظر میں ناچنے گانے کے تاثرات...... ایک آواز ابھرتی ہے)

ے

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

(آواز فیڈ آوٹ ہو جاتی ہے)

امراؤ: ایک تھی وہ ستم پیشہ ڈومنی اور ایک میں ہوں جس نے ساری عمر مرزا نوشہ کا ساتھ نبھالیا اور جسے وہ پھانسی کا پھندہ سمجھتے رہے (ہنستی ہے) مجھے یاد آرہا ہے...... ہاں خوب یاد ہے مجھے عشق کی ناکامی کے بعد وہ روتے...... خوب روتے رہے......

......موسیقی ایک تیز لہرا بھرتی ہے......

امراؤ: (جوان لہجہ) مرزا صاحب مجھے اس گھر میں خدا کا قہر ٹوٹتا دکھائی دیتا ہے۔

غالب: (جوان لہجہ)، (قہرالٰہی...... (قہقہہ لگاتا ہے)

امراؤ: میں کہتی ہوں چھوڑ دے یہ سب کچھ...... یہ شراب...... یہ آوارہ گردی

غالب: ابنِ مریم ہوا کرے کوئی میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

امراؤ: یہ قہرالٰہی ہی ہے جس کی وجہ سے میرے لہو اور گوشت سے بنے سات بچے یکے بعد دیگرے اللہ کو پیارے ہو گئے سات بچوں کی ماں ہو کر بھی میری گود خالی ہے، میرے نوشہ میاں تم سب کچھ جانتے ہو جنت کی حقیقتوں سے لے کر انسانی زندگی کی لاکھوں پیچیدگیوں سے تم واقف ہو پر تم ایک ماں کے درد کو نہ جان سکے (رونے لگتی ہے) تمہارے بچے تمہارے اشعار ہیں تمہاری غزلیں ہیں، جن کی تم پرورش کرتے ہو۔

......موسیقی کی ایک لہر......

امراؤ: (بوڑھا لہجہ) لیکن میں ہی غلطی پر تھی شاید مرزا ٹھیک ہی کہتے تھے، اتنا بڑا آدمی جسے سارا ہندوستان جانتا ہے بھلا کیونکر غلط ہو سکتا ہے، شاید میرے ہی غم جھوٹے تھے...... اُن کے ایک مہربان دوست نواب مرزا مصطفیٰ خان شیفتہ تو ایسا کیا کرتے تھے......

آواز: امراؤ بہن میں تمہارے تمام دکھوں کو محسوس کرسکتا ہوں، میں جانتا ہوں کہ تمہارے اور مرزا کے مزاج میں بہت فرق ہے، ایک طرف نمازی عورت اور دوسرے طرف نوشہ مرزا جیسا رند مشرف لیکن یاد رکھنا آنے والا وقت تمہاری قربانیوں کو نہیں بھول سکے گا تم اس بات پر فخر کرسکتی ہو کہ تم اس شاعر کی رفیقۂ حیات ہو جو سینکڑوں نہیں ہزاروں برسوں کے بعد پیدا ہوتا ہے مرزا جیسے شاعر کو زندگی کا زہر پینا پڑتا ہے...... یاد رکھنا میری بہن آنے والی نسلیں جب کبھی بھی مرزا کا نام لیں گی تب وہ تمہیں بھی عزت اور فخر کے ساتھ یاد کریں گی۔

(......تیز موسیقی کی لہرا بھرتی ہے......)

امراؤ: اوہنہ......میرا نام......

(بادل گرجنے کی آواز)

......غالب کی آواز ابھرتی ہے......

غالب: بیگم مجھے اس بات کا احساس ہے کہ میں اپنی زندگی میں تمہیں کچھ بھی نہ دے سکا......میری اپنی زندگی بے حد مشکلات سے گذری، جوانی میں جوان محبوبہ کا جنازہ آنکھوں کے سامنے اٹھ گیا جس کی ادائیں ہر ہر لمحہ تڑپاتی ہیں گھر میں بچوں کے کھیل کود کی بجائے اُن کی لاشیں نظر آئیں، دلی آنکھوں کے سامنے اجڑی۔ دوست واحباب قتل ہوئے......بیگم میں تمہارے دل کے درد کو بھی جان نہ سکا۔

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

امراؤ: دل کا درد نوشہ میاں کاش تم میرے درد جگر کو پہچان سکتے۔

آواز: کیسی مرضی تھی قدرت کی کہ جس انسان کے شعروں کے ذریعہ انسانی زندگی کو ایک نئی آواز ملی وہ اپنی رفیقۂ حیات کے چہرے پر ایک بھی

مسکان نہ لا سکا، مرزا غالبؔ کی زندگی غموں کی ایک طویل کہانی تھی لیکن وہ اپنے غموں کو شعروں کی زبان دے کر ہلکا تو کر سکتا تھا لیکن یہ عورت...... امراؤ بیگم لمحہ لمحہ سلگتی رہی اس کی دکھوں کی کہانی کون سنے اور کون سنائے گا ؎

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

(بادلوں کی گھڑگھڑاہٹ اور فیڈ اوٹ)

......آہستہ آہستہ دروازہ کھٹکھٹانے اور کھولنے کے تاثرات......

امراؤ بیگم: (اداس اور کمزور لہجے میں) کون

غالب: (تھکی ہوئی آواز) میں ہوں

امراؤ: میں کون؟

غالب: اس کمرے کا مکین...... اسد اللہ خان غالبؔ

امراؤ: (حیرت سے) نوشہ میاں

غالب: بیگم ابھی تک مجھ سے ناراض ہو ؎

تھک تھک کر ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

امراؤ: نوشہ میاں

غالب: بھول جاؤ پرانی باتیں بیگم ہٹا دو اپنے اور میرے درمیان کا یہ پردہ...... اب میرا تنہائی میں جی نہیں لگتا۔ میرے لئے آجاؤ بیگم...... میرے پاس۔

امراؤ: نوشہ میاں

غالب: ؎ رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی
سمجھیو مت کہ پاس درد سے دیوانہ غافل ہے

میرے محبوب تم کو میری خبر بھی ہے...... آگے ناتواں تھا اب نیم جان ہوں آگے بہرا تھا اب اندھا بھی ہوں، جہاں چار سطریں لکھیں انگلیاں ٹیڑھی ہوگئیں...... اکہتر برس جیا۔

امراؤ: نوشہ میاں میں آرہی ہوں

(فیڈ اوٹ)

(صبح کا وقت...... دوبار اللہ اکبر اللہ اکبر کی صدا گونجتی ہیں)

امراؤ بیگم: صبح ہوگئی ہے نماز کا وقت ہے نوشہ میاں میں آرہی ہوں...... آج میں نوشہ میاں کے کمرے میں نماز پڑھوں گی...... ہاں قرآن شریف بھی ساتھ لے لوں۔

چلنے کی آواز۔ کھٹ کھٹ...... دروازہ کھلنے کی صدا

ہلکی ہلکی موسیقی ابھرتی ہے......

امراؤ: وہی کمرہ، وہی جگہ، کتابیں...... قلم اور...... اور...... کتنی مدت کے بعد میں اس کمرے میں قدم رکھا۔ کتنے برس گزر گئے...... یہاں کس قدر اُداسی ہے کتنی تاریکی ہے

غالب کی آواز ابھرتی ہے

غالب: ہر مکاں کو ہے مکیں سے شرف اسد

مجنوں مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے......!

امراؤ: ہاں واقعی ہر مکان کو اپنے مکیں سے شرف ہوتا ہے، مجنوں کا گھر جنگل تھا جو اسی کے دم سے آباد تھا اب وہ مر گیا ہے تو جنگل سُونا پڑا ہے......

(وقفہ)

کلو میاں...... کلو میاں...... شاید سو رہا ہوگا......

(امراؤ بیگم قرآن شریف پڑھنے لگتی ہے)

امراؤ: بسم اللہ الرحمن الرحیم

غالب: (آواز) بیگم

امراؤ: یٰسین و القرانِ الحکیم......

غالب: بیگم

امراؤ: کون ہے کس نے پکارا مجھے

غالب: زندگی اپنی جب اس مشکل سے گزری اسدؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے......!

آواز: نوشہ میاں......کہاں ہو تم......سامنے کیوں نہیں آتے

غالب: مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

امراؤ: اب مجھ سے یہ دوری برداشت نہیں ہوتی......میرے اللہ تو کب بلائے گا مجھے......یہ کیا......کون سی کتاب ہے یہ......دیوان غالبؔ......نوشہ میاں کا دیوان......

امراؤ: یٰسین و القران الحکیم. . .

(فیڈ اوت)

(چلنے کے تاثرات......دروازہ کھولنے کی آواز)

ضیاالدین: کلو میاں......کلو میاں......ارے میاں کہاں ہو

کلو: آیا نواب صاحب......(نزدیک آکر) نواب صاحب آپ اتنی جلدی۔

ضیا: ہاں......جا کر امراؤ بہن کو خبر کرو کہ ہم انہیں لینے آئے ہیں، پھاٹک کے باہر سواری کھڑی ہے۔

کلو: تو کیا واقعی بیگم صاحبہ جا رہی ہے۔

ضیا: ہاں میرے ساتھ۔ میرے گھر ابھی......اسی وقت

(......وقفہ......)

(چلنے کی آواز......)

کلو: (گھبرایا ہوا) حضور بیگم صاحبہ اندر تو نہیں۔

ضیا: (حیراں ہوکر) امراؤ بہن کمرے میں نہیں...... صبح صبح کہاں چلی گئی کیا وہ صبح کی نماز کے لئے مسجد جاتی ہے۔

کلو: نہیں......شاید وہ......مرزا صاحب کا کمرہ......دیکھتا ہوں...... دروازہ اُدھ کھلا ہے۔

(قدموں کی آواز......)

کلو: (چلاتے ہوئے) حضور......بیگم صاحبہ......ادھر آجائے......

(قدموں کی آواز)

ضیا: (چلاتے ہوئے) امراؤ......تم نے آخر اپنی ضد پوری کرلی۔

کلو: بیگم صاحبہ......حضور میں لٹ گیا......حضور (رونے لگتا ہے)۔

ضیا: (روتے ہوئے) تم بھی چلی گئی اپنے نوشہ میاں کے پاس

(بہت سے قدموں کی آوازیں......دبی دبی سی باتیں)

پہلی آواز: امراؤ بیگم وفات پاگئیں۔

دوسری آواز: اِنا للہِ وَاِن اللہ راجعون۔

تیسری آواز: چہرے پر کس قدر سکون ہے......لامثال سکون۔ سبحان اللہ۔

پہلی آواز: غالبؔ نے تجربوں کی آگ سے ہماری زندگی کے کتنے تاریک گوشوں کو منور کیا غالبؔ کا انداز بیاں ان کی فنی عظمت......واہ واہ......

دوسری آواز: امراؤ بیگم نے کتنی عظیم قربانیاں دیں اپنے شریکِ سفر کے لئے......

تیسری: ہاں ان گنت قربانیاں......

کلو میاں: (روتے ہوئے) حضور یہ دیکھئے......یہاں آئے حضور۔

ضیا: (اداس لہجے میں) کیا ہے کلو میاں......(حیران ہوکر) ارے یہ......

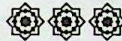
کلو: دیکھ رہے ہیں حضور......

ضیا: اللہ اللہ...... امراؤ بیگم جو زندگی بھر مرزا مرحوم کی شاعری سے الگ تھلگ رہی...... آج اُسی امراؤ بیگم کے ہاتھ میں دیوانِ غالب...... کاش آج مرزا مرحوم ہمارے درمیان ہوتے......

(غالب کی آواز ابھرتی ہے......)

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو ہم زباں کوئی نہ ہو

(موسیقی...... جو آہستہ آہستہ فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے)



امراؤ جان ادا

ریڈیائی ڈرامہ

آوازیں

۱۔مرزا رسوا

۲۔امراؤ جان ادا

۳۔امراؤ جان ادا (امیرن) بچپن کا رول

۴۔منشی

۵۔دلاور خان

۶۔خانم

۷۔نواب سلطان

۸۔مولوی

۹۔عورت

۱۰۔آواز

امراؤ جان ادا

ہلکی ہلکی موسیقی اُبھرتی ہے اور فیڈ اوٹ...... دور سے مردانہ آواز میں یہ شعر سنائی دیتا ہے ؎

سن چکے ہو حال بتاہی کا مری اور سنو
اب تمہیں کچھ مری تقریر مزا دیتی ہے

ہلکی موسیقی پھر اُبھرتی ہے اور فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے...... دور سے نسوانی آواز میں یہ شعر سنائی دیتا ہے ؎

وہ جو لوگ بیٹھے ہیں زلف میں کھوتے ہوئے
مسرتیں میری شریک بزم ماتم ہو گئیں

موسیقی کی ایک اور لہر
اور مشاعرے کا ماحول......

رسوا: کیا کہنا امراؤ جان

ادا: تسلیم مرزا صاحب...... آپ کے سر کی قسم، بس وہ مطلع یاد تھا اور یہ مطلع خدا جانے کی زمانے کی غزل کا ہے، زبانی کہاں تک یاد رہے، بیاض نگوڑی گم ہو گئی۔

منشی: اور وہ مطلع کیا تھا ہم نے نہیں سنا۔

رسوا: آپ تو اہتمام میں مصروف تھے منشی جی، سنے کون

منشی: تو پھر اہتمام آپ کیجیے، بندہ شعر سنے گا

رسوا: معاف کیجئے گا یہ دردِ سر مجھ سے نہ ہو گا

منشی: اچھا وہ مطلع کیا تھا

ادا: میں عرض کئے دیتی ہوں ؎

کعبے میں جا کے بھول گیا راہ دیر کی
ایمان بچ گیا مرے مولا نے خیر کی

منشی: خوب...... بہت خوب...... کوئی اور غزل سناؤ......

ادا: دیکھئے کچھ یاد آیا تو عرض کروں

......وقفہ......

ادا: شبِ فرقت میسر نہیں ہوتی......

(پس منظر میں ذرا سا شور و غل...... چند آوازیں)

آوازیں: خوب...... بہت خوب۔

منشی: خاموش ہو جائے۔ شعر تو سننے دیجئے۔

ادا: یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

شورِ فریاد تا فلک پہنچا
مگر ان کو خبر نہ ہوئی

رسوا: واللہ کیا شعر کیا ہے......

ادا: آپ کی عنایت ؎

میرے کوچے کے بے نواؤں کو
ہوسِ مال و زر نہیں ہوتی

منشی: کیا در فشانی ہے

رسوا: اب میں نواب صاحب کو دعوت سخن دیتا ہوں۔

آواز: لطف ہے کون سی کہانی میں
آپ بیتی کہوں کہ جگ بیتی

ادا: ایک اور شعر یاد آرہا ہے

رسوا: ہم سننے کے لئے بے تاب ہیں

ادا: عرض کیا ہے

کس کس کو سنائیں حالِ دلِ زار اے ادا

آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی

اس کے ساتھ ہی موسیقی ابھرتی ہے اور فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے

قدموں کی چاپ ابھرتی ہے......اور پھر دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز

ادا: آیئے......اندر آجایئے......دروازہ کھلا ہی ہے

رسوا: آرہا ہوں......(اندر آتے ہوئے) ادا ہم کبھی نہ مانے گے دل کو دل کی خبر نہیں ہوتی

......واہ امراؤ صاحبہ ماننا پڑے گا آج تو آپ کی غزل حاصل مشاعرہ رہی......

ادا: عنایت ہے، بندہ نوازی ہے۔ چلے گئے وہ لوگ

رسوا: ہاں گئے

ادا: سب کے سب

رسوا: شکر ہے سب کے سب رخصت ہو گئے

ادا: اور آپ

رسوا: آپ کے پاس آیا ہوں۔

ادا: خدا سے ڈریئے مرزا صاحب، کیسی باتیں کرتے ہیں آپ

رسوا: سچ ہی تو کہتا ہوں

ادا: وجہ......کوئی وجہ تو ہو گی۔

رسوا: اس وقت تک نہیں جاؤں گا......یہیں بیٹھا رہوں گا جب تک آپ اپنی سرگذشت نہ سنا دیں۔

ادا: (لمبا سانس لے کر) پھر کبھی سنیئے گا......ہاں پھر کبھی سناؤں گی فرصت سے

رسوا: جی نہیں ...... یہ نہیں ہو سکتا

ادا: کیا رکھا ہے مجھ بد نصیب کی سرگزشت میں جو آپ اس قدر بے تاب ہیں مشتاق ہیں، مری حالاتِ زندگی سن کر آپ بالکل خوش نہ ہوں گے۔

رسوا: جو کچھ بھی ہو، میں نے عہد کر رکھا ہے کہ آج آپ نے میری بات پوری نہ کی تو پھر میں آپ سے عمر بھر نہ بولوں گا۔

ادا: آپ بھی رسوا صاحب بعض اوقات بچوں کی طرح ضد کرنے لگتے ہیں۔ مجھے زیادہ تفصیل یاد نہیں ہاں اتنا جانتی ہوں کہ............

(ہلکی ہلکی موسیقی کے پس منظر میں امراداجان ادا کی آواز سنائی دیتی ہے......)

ادا: فیض آباد میں شہر کے کنارے کسی محلے میں میرا گھر تھا۔ پختہ مکان تھا۔ درودیواریں پختہ تھیں البتہ آس پاس کچھ کچے اور کچھ پکے جھونپڑے ضرور نظر آتے تھے ہمارے مکان کے سوا اس محلے میں ایک اور مکان تھا ہمارے مکان سے ذرا اونچا......اور اس مکان کا مالک......

رسوا: کون تھا اس کا مالک

ادا: دلاور خان

رسوا: دلاور خان

ادا: ہاں چوروں سے ملا ہوا تھا۔ ڈاکوؤں سے اس کا رابطہ تھا۔ لکھنو میں برسوں قید رہا پھر نہ جانے کیسے اور کس کی سفارش سے جیل سے چھوٹ کر آیا۔ ہمارے ابا حضور سے سخت عداوت رکھتا تھا۔

رسوا: عداوت......وہ کیوں؟

ادا: فیض آباد میں جب گرفتار ہوا تو اس کے چال چلن کی تحقیقات کے سلسلے میں چند لوگوں سے بیان کیئے گئے۔ ان میں ابا بھی تھے۔ میرے ابا تو سچے اور سادے تھے، جب ان کے ہاتھ میں کلام پاک رکھ کر پوچھا گیا تو انہوں نے دلاور خان کا حال صاف صاف بتا دیا۔ ابا کی گواہی پر اسے قید ہوئی......جب وہ قید سے چھوٹ کر آیا......

(پسِ منظر میں دور سے دلاور خاں کی آواز ابھرتی ہے......)

آواز: جیل سے لوٹ آیا ہوں...... بدلہ لوں گا...... انتقام لے کر ہی رہوں گا......

(اور آواز فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے......)

رسوا: ابا کیا کرتے تھے،

ادا: بس اتنا یاد ہے کہ لوگ اُنہیں جمادار کہتے تھے۔ جب کبھی وہ وردی پہن کر گھر سے نکلتے تو لوگ جھک جھک کر سلام کیا کرتے تھے۔

رسوا: کوئی بھائی بہن۔

ادا: صرف ایک چھوٹا بھائی تھا...... ہائے کیا دن تھے وہ...... دن بھر اپنے بھائی کو کھلاتی پلاتی تھی

......بچوں کے ہنسنے کی آوازیں

ادا: شام کو جب ابا گھر لوٹ کر آتے تو کچھ نہ پوچھیئے رسوا صاحب......خوشی کی کوئی انتہا نہیں ہوتی...... (لمبی سانس لیتی ہے)......اور......اور پھر جب وہ دن یاد آتا ہے......تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے......

رسوا: وہ دن......کیا ہوا تھا اُس دن......

ادا: ایک دن خدا جانے کس طرف نکل پڑی، دیکھتی کیا ہوں کہ سامنے دلاور کھڑا ہے......

(ہلکی موسیقی کی لہر اور پھر ایک مردانہ ہنسی)

Flash Back

دلاور: چلو بیٹے کبوتر لے لو......

(امراؤ جان ادا کا بچپن......بچپن کے رول میں ادا)

ادا: (چھوٹی بچی کی آواز) کبوتر......میرے کبوتر

دلاور: ہاں کبوتر تمہارے کبوتر......دیکھو تو سہی کتنے اچھے ہیں خوبصورت ہیں، پیارے پیارے ہیں......تمہارے ساتھ رہیں گے......تمہارے ساتھ کھیلیں گے۔

ادا: پر میں...... یہ کبوتر

دلاور: تیرے ابا صبح دے گئے تھے آؤ گھر میں رکھتے ہیں...... چلو......

ہلکی موسیقی کے پس منظر میں دلاور کی ہنسی سنائی دیتی ہے......!

Flash back ends

ہلکی موسیقی

ادا: میں اس کے دام میں آگئی ساتھ چل پڑی۔

رسوا: اور پھر

ادا: اب جو اِن کے گھر جا کر دیکھتی ہوں کہ گھر خالی تھا...... خاموش اور سنسان...... میں مکان میں داخل ہوئی تو اس نے کنڈی بند کرلی...... میں نے چلانا چاہا لیکن اس نے میرے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا، میں مشکل سے سانس لے سکی اور پھر اس کی روزدار آواز ابھری......

Flash Back

دلاور: بیل گاڑی تیار رکھو پیر بخش...... ابھی اسی وقت میں لونڈیا کو لے کر جا رہا ہوں، ہمیں وقت کا فائدہ اٹھانا چاہیے...... ورنہ...... وقت جانے کب اور کیسے ہمارے دیکھتے دیکھتے ہم سے روٹھ کر چلا جائے گا......

......بیل گاڑی کے دوڑنے کی آوازیں ابھرتی ہیں......

دلاور: دیکھا پیر بخش...... سپاہی کا پوت بارہ سال کے بعد بھی اپنا بدلہ لیتا ہے اب کیسے تلملایا پھرتا ہوگا...... پیر بخش پورے بارہ سال جیل میں رہا...... کیا کیا مصیبتیں اٹھائیں...... یہ تو میرا پہلا وار تھا...... میں تو اس کو جان سے ماردوں گا۔

(ادا کی معصوم سی سسکیاں ابھرتی ہیں)

دلاور: خاموش ہو جاؤ لڑکی......

(سسکیاں رُکنے کے تاثرات)

دلاور: پیر بخش سوچ رہا ہوں کہ لکھنؤ چلا جاؤں وہاں جا کر اس چھوکری کو فروخت کروں

ہاں ہاں بیچ ڈالوں...... وہاں میرا سالا ہے نا...... کریم...... اس کی روٹی روزی تو اس پر ہی چلتی ہے جانے اب تک کتنی لڑکیاں پکڑ کر لے گیا اور لکھنؤ جا کے دام کھرے کر لے......

بیل گاڑی کے تیز تیز چلنے کے تاثرات......

اور فیڈ اوٹ......

سارنگی اور طبلہ بجانے کے تاثرات......

دلاور: خانم صاحبہ...... آداب۔

خانم: ٹھہرو...... تم سے کہہ رہی ہوں

سارنگی اور طبلہ بجانے کی آوازیں بند ہو جاتی ہیں۔

خانم: تم لوگ اندر جاؤ...... اُستاد جی آپ بھی

......وقفہ......

خانم: یہی وہ چھوکری ہے جس کے بارے میں کریم کہہ رہا تھا۔

دلاور: جی ہاں۔

خانم: تو پھر ہماری بات منظور ہے۔

دلاور: کچھ زیادہ مل جائے تو......

خانم: نہیں اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں دے سکتے۔ ہاں اس دوسری چھوکری کا کیا ہوا جس کے بارے میں کریم بتا رہا تھا۔

دلاور: اس کا سودا ہو گیا...... ایک بیگم صاحبہ نے گھر کے لئے مول لے لیا۔

خانم: تو پھر منظور ہے۔

دلاور: ٹھیک ہے۔

خانم (دور سے) بوا حسینی...... صندوقچے سے سو سوا سو روپیہ نکال کر دیدو

......وقفہ...... قدموں کی چاپ

خانم: یہ مول لے لیجئے اور لڑکی کو ہمارے ہاں چھوڑ دیجئے......

......قدموں کی چاپ......

خانم: چلے گئے خدا جانے کس کی لڑکی ہے ماں باپ کا کیا حال ہوا ہوگا...... جانے کہاں سے اٹھا کر لے آئے ہیں...... ذرا بھی خوفِ خدا نہیں...... بوا حسینی...... عذاب وثواب تو اُن کی گردنوں پر ہوگا...... ہمیں کیا یہاں نہ بکتی تو کہیں اور بکتی......اور خانم...... یہ چھوکری تمہارے تحویل میں رہے گی...... کیا نام ہے تمہارا۔......

ادا: (سسکیاں لیتے ہوئے) امیرن

خانم: کہاں سے آئی ہو۔

ادا: بنگلے سے

خانم: اچھا تو تمہارا مطلب فیض آباد سے ہے اور تمہارے باپ کا نام

ادا: جمادار

خانم: تم بھی غضب کرتی ہو۔ بھلا جمعدار بھی کوئی نام ہوا...... ہاں کیا نام بتایا تھا تم نے

ادا: امیرن

خانم: یہ نام ہمیں پسند نہیں...... ہم تو......(سوچ سوچ کر) ہم تو...... ہم تو تمہیں امراؤ کہہ کر پکاریں گے......اور لڑکی سنو...... امراوٴ کے نام پر ہی تم بولنا۔

موسیقی اور فیڈ اوٹ......

Flash Back ends

ادا: مرزا رسوا صاحب ہر عورت کی زندگی میں ایک وہ زمانہ آتا ہے جب وہ چاہتی ہے کہ کوئی اسے چاہے، یہ نہ سمجھئے گا کہ یہ خواہش چند روز ہوتی ہے اور سن کے ساتھ اس کا نشو ونما ہوتا رہتا ہے جس قدر عمر بڑھتی ہے اس قدر خواہش بھی بڑھتی رہتی ہے ؎

کچھ نہ پوچھ شباب کا عالم

کیا کہوں کیا عجب زمانہ تھا......

رسوا: آگے...... آگے کا حال سنائیے۔

ادا: کیا سناؤں

عشق میں حسرت دل کا تو نکلنا کیسا
دم نکلنے میں کم بخت مزا ہوتا ہے

رسوا: کیا خوب کہا ہے...... برمحل...... بروقت...... کچھ اور سنائیے۔

ادا: شعر یا آپ بیتی۔

رسوا: پہلے شعر...... پھر آپ بیتی...... جگ بیتی

ادا: تو سنئیے مرزا سورا

کچھ بھی اثر ہو تو شرربار کیوں
ورنہ شعلہ بھی حقیقت میں ہوا ہوتا ہے

امیرن سے ادا بن گئی...... کچھ دنوں بعد جب طوائفوں کے شمار میں آئی تو لوگ امراؤ جان کہنے لگے...... امراؤ جان ادا۔ خانم کے گھر میں ہی تعلیم پائی طبیعت کو فن موسیقی سے لگاؤ تھا، آواز پکے گانے کے لائق تھی سرگم صاف ہونے کے بعد استاد نے لفظوں کے استعمال سے روشناس کرایا......

(دور سے کسی نسوانی آواز میں گانے کے دو بول ابھرتے ہیں اور فیڈ اوٹ......

ادا: سب سے پہلا مجرا نواب شجاعت علی خان کے لڑکے کی شادی میں ہوا، بڑی یادگار محفل تھی۔ عطر اور پھولوں کی خوشبوں سے ساری بارہ دری مہک رہی تھی، صاف ستھرا فرش ایرانی قالین...... مسند تکیئے...... بیش قیمت شیشہ وآلات کی روشنی سے رات دن بن چکی تھی......

پس منظر میں گانے کی آواز

آج اس بزم میں وہ جلوہ نما ہوتا ہے
دیکھتے دیکھتے ایک آن میں کیا ہوتا ہے

(دور سے واہ واہ کی آوازیں سنائی دیتی ہیں)

رسوا: اور پھر

ادا: پھر نواب سلطان صاحب کا پیغام ملا......اُن کا پیغام لے کر کوئی آیا ساتھ ہی اس غزل کی نقل مانگی تھی جو کل شب میں نے گائی تھی۔ ساتھ میں کچھ اشرفیاں بھی بھجوائی تھیں......دوسرے شب نواب سلطان صاحب تشریف لے آئے......

ہلکی موسیقی اور فیڈ اوٹ

Flash Back

نواب: آپ نے تو ہمیں فریفتہ کرلیا......اب تو لگتا ہے کہ بغیر آپ کے قرار ممکن نہ ہوگا۔

ادا: نواب سلطان صاحب یہ سب آپ کی قدر دانی ہے ورنہ میں کیا میری حقیقت کیا۔

نواب: آپ پڑھ لکھ لیتی ہیں نا۔

ادا: جی ہاں کچھ کچھ......

نواب: پھر تو آپ سے قلم سے ہی گفتگو ہوگی۔ ویسے آپ کو شعر و شاعری کا بھی ذوق ہے۔

ادا: یہ فقط آپ کی عنایت ہے۔

نواب: کوئی شعر سنایئے۔

ادا: فرض ہے ضبط نالہ و فریاد
جس سے ناخوش ہو تم وہ عادت کیا

وقفہ......ہلکی موسیقی

Flash Back ends

رسوا: اور پھر آگے کا حال سنایئے۔

ادا: پھر نواب جعفر علی خان سے ملاقات ہوئی......عمر کوئی ستر برس کے قریب......نہ منہ میں دانت، نہ پیٹ میں آنت......کمر خم ہوگئی تھی سر پر ایک سیاہ بال بھی نہ تھا وہ سوز خوانی میں یکتا تھے۔ ان کی بدولت ہی سوز خوانی میں میری شہرت دور دور

تک پھیل گئی یہاں تک کہ نواب بلکہ کنیز کے محل تک رسائی ہوگئی...... پھر......
پھر میں فیض آباد چلی آئی......

رسوا: فیض آباد چلی آئیں......اپنے شہر اپنے گھر

ادا: ہاں......ہاں......(خاموشی)......مجھے ایک اور واقعہ یاد آرہا ہے۔

رسوا: سنائیے......ضرور سنائیے۔

ادا: ایک بار ایسا ہوا کہ ایک شخص سرکاری وردی پہنے گھوڑے پر سوار میرے سامنے سے گزرا......میں ڈر کے مارے ایک پتلی سی گلی چلی گئی اس گلی میں ایک مسجد تھی۔

(دور سے گھوڑے کے ٹاپوں کی آوازیں)

ادا: میں نے خیال کیا سب سے بہتر خدا کا گھر ہے، مسجد کے صحن کا دروازہ کھلا تھا میں اندر چلی گئی......یہاں ایک مولوی صاحب سے سامنا ہوا......کالے تھے۔ سر منڈا ہوا......دھوپ میں ٹہل رہے تھے......کہنے لگے......
......ہلکی موسیقی

Flash back

مولوی: کیوں بی بی آپ کا یہاں کیا کام

ادا: مسافر ہوں، خدا کا گھر سمجھ کر تھوڑی دیر کے لئے یہاں آ گئی۔ اگر آپ کو ناگوار ہو تو ابھی چلی جاؤں گی

مولودی: کہاں سے آئی ہو

ادا: میں کہیں سے بھی آئی ہوں مگر یہیں ٹھہرنے کا ارادہ ہے۔

مولودی: مسجد میں

ادا: جی نہیں آپ کے حجرے میں

مولوی: لاحول ولا قوۃ......میں یہاں اکیلا رہتا ہوں اسی لئے تو پوچھا تھا کہ مسجد میں آپ کا کیا کام

ادا: اور آپ کا کیا کام ہے۔

مولوی: میں لڑکے پڑھاتا ہوں۔

ادا: میں آپ کو پڑھاؤں گی۔

مولوی: لاحول ولا قوۃ

ادا: یہ آپ بار بار کیوں دہراتے ہیں۔ یہ کیا شیطان آپ کے پیچھے پڑا ہے۔

مولوی: شیطان آدمی کا دشمن ہے۔ اس سے ہر وقت ڈرنا چاہئے۔

ادا: مولوی صاحب...... خدا سے ڈرنا چاہئے...... موئے شیطان سے کیا ڈرنا......

......وقفہ......ہلکی موسیقی

Flash back ends

ہلکی موسیقی کی ایک لہر

ادا: کچھ اور بھی عرض کروں

رسوا: بس اب معاف کیجئے۔

ادا: ابر بھی ہے ہوائے سرد بھی ہے

پھر وہ یادش بخیر یاد بھی ہے

رسوا: خوب، بہت خوب...... لیکن ابھی میری تشنگی قائم ودائم ہے

ادا: مطلب

رسوا: مطلب یہ کہ......

ادا: (بات کاٹ کر) ادا کی کہانی بڑی طویل ہے۔ کیا کیا سناؤں کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ آپ کچھ اور جاننا چاہتے ہیں

؎ نہ پوچھ اعمال کی دل آویزی

تمام عمر کا قصہ لکھا ہوا پایا

رسوا: فیض آباد...... وہاں پھر کیا ہوا

ادا: خود کو پتہ نہیں ہوتا کہ تقدیر اُسے کہاں لے جارہی ہے...... قسمت کی ماری......

وہاں گئی جہاں میرا گھر تھا...... مجرا ختم ہوا تو ایک عورت نے پردہ اٹھا کر مجھے بلایا۔

......وقفہ......

Flash Back

ہلکی ہلکی موسیقی

عورت: لکھنو سے تم ہی آئی ہو

ادا: جی میں ہی آئی ہوں

عورت: کیا نام ہے تمہارا

ادا: آپ نہیں جانتی میرا نام امراؤ جان ہے۔

عورت: تمہارا خاص وطن لکھنو ہے۔

ادا: کیا بتاؤں اصل وطن تو یہی ہے جہاں میں کھڑی ہوں۔

عورت: کیا تم فیض آباد کی رہنے والی ہو۔

ادا: جی ہاں

عورت: اور یہاں......

ادا: یہاں آکر تقدیر کا لکھا پورا کرتی ہوں
(ادا رونے لگتی ہے)

عورت: ارے روتی کیوں ہو...... کون ہو آخر

ادا: کیا بتاؤں کون ہوں...... کچھ کہتے بن نہیں پڑتا

عورت: ذرا اپنا کان دکھالے......

ادا: کیا بات ہے یہ دیکھئے۔

عورت: (حیران ہو کر) ہائے امیرن...... امیرن میں تمہاری ماں ہوں...... ماں

ادا: اماں...... اماں...... آپ...... آپ
(دونوں رونے لگتی ہیں)

تیز موسیقی سنائی دیتی ہے

Flach back ends

ادا: رسوا صاحب میرے دل کا عجیب حال تھا روتی جاتی تھی ماں گلے ملتی جاتی تھی، رات بھر وہیں رہی۔ بھائی پہلے تو بہت بگڑا لیکن جب میں نے رو رو کر اپنی داستانِ سنائی تو خاموش ہو گیا......اور صبح ہوتے ہی وہاں سے رخصت ہوئی۔

رسوا: اور آپ کی ماں

ادا: چلتے وقت جس حسرت بھری نظر سے اماں نے مجھے دیکھا وہ میں مرتے دم تک بھول نہ سکوں گی......دوسرے دن فیض آباد سے پھر لکھنو چلی آئی۔ کچھ دن بعد......

رسوا: کچھ دن بعد......کیا ہوا

ادا: وہ شاید برسات کے دن تھے۔

(پس منظر میں بادلوں کی گن گرج)

ادا: اُس دن میں بھی اپنے دوسرے لوگوں کے ساتھ جنگل کی جانب چلی گئی ہم نے ایک جگہ ڈیرہ ڈالا۔ بڑا ہی دلکش موسم تھا، ایسے ہی بے مطلب سب کو چھوڑ کر اکیلی ٹہلتی ہوئی تالاب کی طرف نکل گئی۔ کچھ ہی دور گئی تھی کیا دیکھتی ہوں کہ ایک آدمی بوسیدہ لباس میں کھرپی ہاتھ میں لئے کچھ کھود رہا ہے۔ میری اور اس کی آنکھیں دو چار ہو گئیں اور مجھ پر سکتہ سا ہو گیا۔

رسوا: کون......کون تھا وہ

ادا: دلاور خان...... مجھے دیکھ کر وہ نالے کی طرف بھاگا میں نے فوراً ہی پاس کے تھانے میں رقعہ لکھا تھانیدار نے تھوڑی سی تلاش و جستجو کے بعد دلاور خان کو گرفتار کر لیا۔ کئی خون اور اغوا کے الزام تھے اس پر......دو مہینے مقدمہ چلا اور پھانسی کی سزا ہوئی......مرزا رسوا صاحب اب بہت رات ہو گئی ہے۔

رسوا: ہاں رات تو ہو گئی ہے لیکن ابھی آپ کی داستان۔

ادا: رسوا صاحب میری داستان کبھی مکمل نہ ہوگی لیکن اپنی سرگذشت کو مختصر کرنا چاہتی ہوں۔ شاید اس لئے کہ میری اس داستان کی شروعات دلاور سے ہوئی اور اس کا اختتام بھی دلاور کے ساتھ ہی ہوگیا......

رسوا: دلاور خان کو اپنے کئے کی سزا مل گئی۔

ادا: ......اللہ کو یہی منظور تھا......میں تو اب اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں۔ اب کسی بات کی تمنا نہیں......البتہ......

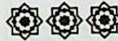
رسوا: کہئے

ادا: شعر سناتی ہوں۔

رسوا: ضرور......

ادا: مرنے کے دن قریب ہیں شاید کہ اے حیات
تجھ سے طبیعت اپنی بہت سیر ہوگئی......

......موسیقی اور فیڈ اوٹ......



میرا جی

ریڈیو ڈرامہ

آوازیں

۱۔میرا جی
۲۔ایک آواز (مردانہ)
۳۔راوی
۴۔میرا سین
۵۔منٹو
۶۔ایک آواز (زنانہ)

میراجی

پس منظر میں ہلکی ہلکی موسیقی ابھرتی ہے......
مئے خانے کے مدھم مدھم سے تاثرات......

میراجی: نگری نگری پھرا مسافر گھر کا راستہ بھول گیا
کیا ہے تیرا کیا ہے میرا اپنا پرایا بھول گیا......!

آواز: بہت ہو چکی......اب چلنا چاہیے......رات اُترنے والی ہے

میراجی: رات......ہاں رات اُترنے والی ہے......لیکن......

آواز: لیکن کیا

میراجی: آؤ اپنے باغی وحشی تخیل کی
دھندلے اندھے لمحوں میں
سُن لو کہانی راتوں کی......

آواز: چلئے بھی اب

میراجی: تم چلو گے میرے ساتھ

آواز: کہاں

میراجی: جہاں جانے کے بہت سے راستے ہیں لیکن واپس آنے کا کوئی راستہ نہیں، وہاں ایک دیوی رہتی ہے جس کے علم میں بنگال کا جادو ہے......میں تو بنگال کے جادو سے بچ نہ سکا......میں تو بنگال کے حسن اور شراب کی سرمستی کا شکار

ہوں (زبان میں ذراسی لڑکھڑاہٹ) بھائی میں تو بنگالن میرا سین کا پچاری ہوں ؂

ایک مورت ہے میٹھی من موہنی صورت ہے
انمول بھری اک چندر کرن لہراتی ہے
بہتی ندی بل کھاتی ہے......!!

......ہلکی موسیقی ابھرتی ہے......موسیقی کی ایک خاموش لہر......

میراجی: غیر آباد جزیروں میں چلا جاؤں گا
عمر بھر لوٹ کے میں پھر کبھی نہ آؤں گا

آواز: کب تک تصورات کی دنیا سجائے رکھیں گے آپ......کب تک تخلیلی دنیا کو آباد کرتے رہیں گے آپ۔

میراجی: لیکن آپ ہیں کون۔ میری زندگی میں کریدنے سے آپ کو ملے گا کیا...... میرے دورد کرب کے اسباب تلاش کر کے کیا آپ مجھے آزاد اور آسودہ حال زندگی سے ہم کنارے کر سکتے ہیں؟......(آہستہ سے)......زندگی ایک تہہ خانہ ہے اور میں اس تہہ خانے کا ایک مکین......گم شدہ مکین......اکیلا تنہا...... اپنے سوچوں میں گم......

آواز: اس تہہ خانے سے باہر آجایئے......کھلی کھلی سی دنیا میں......یہ دنیا حسین ہے اور جوان بھی اس کی رنگینی اس قدر متاثر کن ہے کہ......

میراجی: (بات کاٹتے ہوئے) نہیں میرے دوست، اس دنیا میں غربت اور افلاس ہے، تنگ دلی اور تنگ طرفی ہے، فاقہ اور فاقہ مستی ہے......اور پیاس ہے......بہت پیاس

......گلاس میں شراب ڈالنے کی ایک مدھم سی آواز......

آواز: آپ ایک شاعر ہیں، قلم کار ہیں، ادبِ انسانیت کے خادم ہیں......شاعر تو ادراک واحساس کی نئی شکلیں تلاش کرتا ہے، ایک شاعر کا جنون فرہاد اور

مجنون کے جنون سے زیادہ قوت کا حامل ہے، شاعر تو دل میں چھپی روشنی اور تاریکی کو اجاگر کر کے شعر میں ڈھالتا ہے، اس کے شعروں میں روحانی کرب اور تڑپ نظر آتی ہے......اور آپ......!

میراجی: (بات کاٹتے ہوئے) رکیئے......ذرا رکیئے......اور مجھے بتادیجئے کہ آپ ہیں کون؟

آواز: میں کوئی غیر نہیں، آپ کے لئے اجنبی نہیں......میں تو......آپ کے اندر کی آواز ہوں......جی ہاں آپ کے اندر کی آواز میراجی......نہیں ثناء اللہ ڈار صاحب

موسیقی کی ایک تیز لہر ابھرتی ہے اور آہستہ سے فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے......

راوی: حسن یہ پوچھنے لگا ہے عشق سے......آرزو کیا ہے
عشق نے سن کے یوں کہا حسن سے......آہ کچھ نہیں
عمر گزر گئی تمام
راہ طلب میں عشق کو مل گئی شہرت دوام
منزل آخر ملی......غور کرو تو کچھ نہیں......!

ثنااللہ ڈار......میراجی ۲۵ مئی ۱۹۱۲ء کو گجرنوالہ میں پیدا ہوئے اُن کے والد کا نام منشی مہتاب الدین تھا اور والدہ کا نام زینب بیگم۔ وہ نسلاً کشمیری تھے، اُن کے آباواجداد آریہ نسل سے تعلق رکھتے تھے......پہلے ان کا تخلص ساحری تھا، پھر میراجی ہو گیا، وہ ادبی گاندھی کے نام سے بھی جانے جاتے تھے......

زنانہ آواز: حالانکہ تعلیمی لحاظ سے وہ میٹرک بھی نہ کر سکے تھے لیکن ان کی ادبی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۳۵ سے ۱۹۴۱ تک وہ لاہور سے شائع ہونے والے مصروف ومقبول جریدے ادبی دنیا کے نائب مدیر رہے۔ ۱۹۴۲ سے لے کر ۱۹۴۳ عیسویں تک آل انڈیا ریڈیو دلی میں کام کیا۔ ۱۹۴۴ سے لے کر ۱۹۴۵ عیسویں تک وہ باقاعدگی کے ساتھ ''ماہنامہ

ساقی'' دلی کے لئے کالم لکھتے رہے اور پھر ۱۹۴۸ اور ۱۹۴۹ کے دوران
''ماہنامہ خیال'' کی ادارت سنبھال لی۔

راوی: اپنی زندگی میں آخری بار ۱۹۴۶ عیسوی کے اوائل میں لاہور گئے، پھر دلی لوٹ آئے دلی سے ہی جون ۱۹۴۶ کو بمبئی گئے اور پھر ۳ نومبر ۱۹۴۹ کو ممبئی کے کنگ ایڈوار ہاسپٹل میں انتقال کر گئے اور انہیں ممبئی کے میرن لائن قبرستان میں دفنایا گیا۔

موسیقی......اور فیڈ اوٹ......

راوی: کیوں صرف اچھوتا
انجان، انوکھا
اک خوابِ بے خلوت
کیوں صرف تصور
بہلاتا ہے مجھ کو
اور
کیوں لمس کی حسرت کے منجو سے
ملتی نہیں مجھ کو
بے قید رہائی......؟!

زنانہ آواز: میرا جی کی تصانیف میں میرا جی کے گیت، میرا جی کی نظمیں، گیت ہی گیت، پابند نظمیں، تین رنگ اور سہ آتشہ قابلِ ذکر ہیں۔ وہ مترجم بھی تھے، انہوں نے سنسکرت شاعر دامودر گپت کی کتاب کا ترجمہ کر کے قسط وار ماہنامہ خیال میں شائع کیا، میرا جی کی وفات کے بعد یہ ترجمہ کتابی صورت میں 1950 عیسوی میں لاہور سے شائع ہوا......

راوی: میرا جی نے عمر خیام کی رباعیات کا ترجمہ بھی کیا تھا جو خیمے کے آس پاس کے نام سے ۱۹۶۴ء میں مکتبہ جدید لاہور نے اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔ میرا جی

نے اپنی زندگی میں قدیم بھارت کے شاعروں...... ودیاپتی، امارو چنڈی داس وغیرہ کی نظموں کا مطالعہ کر کے ان کے ترجمے بھی کئے...... ان تخلیقات سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ میراجی نہ صرف اردو زبان کے شیدائی تھے بلکہ انہیں فارسی اور سنسکرت جیسی دوسری زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا۔

......ہلکی ہلکی موسیقی ابھرتی ہے......

اور اسی موسیقی کے پسِ منظر میں......

راوی: نہ صحرا نہ پربت، نہ کوئی گلستاں
فقط اب سمندر بلاتا ہے مجھ کو
کہ ہر شئے سمندر سے آئی...... سمندر میں جا کے ملے گی

میراجی کی نظر میں سمندر زندگی کی ایک عمیق علامت ہے، یہ زندگی کا منبع ہے، سمندر وقت کی علامت ہے، وحدتِ کثرت کا حصہ ہے جس طرح فرد سماج کا اور قطرہ سمندر کا حصہ ہیں

(ہلکی موسیقی کی لہر)

زنانہ آواز: میرا سین سے میراجی کے عشق نے میراجی کی شاعری میں عشق مجازی کے تصوف کا روپ لیا ہے اور یہ تصوف انہیں کبھی سچا عاشق اور کبھی سودائی بنا دیتا ہے......

راوی: میراجی کو زندگی میں مسرت و شادمانی اور تسکین و آسودگی کے بہت کم لمحے نصیب ہوئے لیکن ان لمحوں کو انہوں نے اپنے ملنے جلنے والوں کی نذر کر دیا تھا۔ میراجی دوسروں کا درد تو بانٹ سکتے تھے لیکن اپنے درد کو دوسرے کے ساتھ بانٹنے میں یقین نہیں رکھتے تھے......

زنانہ آواز: اور میرا سین...... میراجی کی محبت...... میراجی کی شاعری......
ہلکی ہلکی موسیقی ابھرتی ہے...... خوابوں کی دنیا...... خواب کے تاثرات......!!

میراسین: کیا سوچا آپ نے

میراجی: کس بارے میں

میراسین: اپنے گھر کے بارے میں

میراسین: اپنا گھر وہی ہے جہاں میں رہتا ہوں

میراسین: یہ بھی کوئی گھر ہوا

میراجی: کیوں...... یہاں کیا نہیں ہے

میراسین: وہ کچھ بھی نہیں جو ایک گھر میں ہونا چاہیے

میراجی: میں تو ہوں۔

میراسین: ہاں آپ تو ہیں آپ کی کتابیں ہیں، شاعری ہے جام ہے وصراحی ہے

میراجی: اور بھی بہت کچھ ہے

میراسین: وہ کیا

میراجی: محبت...... محبت کے خزانے...... تمہیں یاد ہے میری خاموش محبت کتنی پرانی ہے

میراسین: ہاں...... (تیزی سے) نہیں تو

میراجی: اتنی پرانی کہ مجھے یاد ہی نہیں کہ اس کا آغاز کب کہاں اور کیسے ہوا، بس جو یاد ہے وہ صرف یہی ہے کہ میں...... میں...... بے تحاشا محبت کرتا ہوں اپنی میرا سین سے...... لیکن......

میراسین: لیکن کیا

میراجی: ؎ میں تو ایک منشی ہوں تو اُونچے گھر کی رانی ہے
یہ میری پریم کہانی ہے اور دھرتی سے بھی پرانی ہے

میراسین: آپ جذباتی بنتے جارہے ہیں

میراجی: ہاں شاید...... دراصل جذبات محبت کے اظہار میں مدد کرتے ہیں، میری محبت میرا جنون ہے اب میں کیسے سمجھاؤں میرا...... آؤ اور چند لمحوں کے لئے

یہ جنون آپس میں بانٹ لیں اور محبت کو ابدی بنا دیں......

میراسین: کچھ دنیا کی بھی خبر ہے

میراجی: نہیں ہے

میراسین: ہاں ہے تبھی تو کہہ رہی ہوں۔

میراجی: کچھ میں بھی سنوں

میراسین: دنیا والے محبت کرنے والوں کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔

میراجی: مجھے ایسے لوگوں سے کوئی دلچسپی نہیں، مجھے ان کی کوئی پرواہ نہیں کیونکہ محبت میرے لئے روشنی کا مینار ہے جس کو دیکھ کر مجھے اپنے سامنے کی ہر چیز بے حقیقت دکھائی دیتی ہے۔

میراسین: تو پھر حقیقت کیا ہے۔

میراجی: حقیقت تم ہو، میں ہوں......تمہارا لازوال حسن ہے، میری لازوال شاعری ہے......آؤ......میرے قریب آؤ

میں ہوں بھنڈار دکھوں کا میرے پاس خزانہ ہے

میں نے اوروں کے دکھ میں اپنے آپ کو پہچانا ہے......!

(صبح کے آثار......دور سے اللہ اکبر کی صدا......

میراجی کے نیند سے جاگنے کے تاثرات......)

ہلکی موسیقی اور فیڈ اوٹ......!!

راوی: میرا ایک بنگالی لڑکی تھی جو لاہور کے کالج میں پڑھتی تھی......پتلی سی دبلی سی میانے قد کی......بال سندر تھے اور آنکھیں اس کی بے حد خوبصورت تھیں، میراجی نے پہلی بار اسے یونیورسٹی گراونڈ میں کھیلوں کے ایک مقابلے میں دیکھا تھا......

زنانہ آواز: وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ گھوم رہی تھی، میراجی کھوئے کھوئے انداز میں اس کے سامنے کھڑے ہو گئے اور اس کی جانب دیکھنے لگے......دیکھتے ہی

رہے......ہونٹوں پر کوئی بات آتے آتے رک گئی......وہ میرا سے کچھ کہنا چاہتے تھے پر زبان ہونٹوں کا ساتھ نہ دے رہی تھی......پھر میرا جی......

میرا جی: دیکھئے میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں......

ایک بہت ہی تیز موسیقی کی لہر......جو آہستہ سے ہلکی ہلکی موسیقی میں بدل جاتی ہے......

راوی: میرا......میرا سین میرا جی کی زندگی کا ایک اہم ترین حصے کا روپ اپنا چکی تھی۔ وہ ثناءاللہ سے میرا جی بن گیا لیکن میرا سین سے ثناءاللہ ڈار کا وصال نہ ہو پایا......اس کے نتیجے میں میرا جی کی بے حد پیار کرنے والی شخصیت پاش پاش ہو گئی......ثناءاللہ ڈار نے میرا جی کا نام اپنا کر اپنے آپ کو لہولہان کیا اور اپنے غم کو شراب میں ڈبو دیا......پینے کے بعد وہ اکثر کہا کرتے تھے، لہک لہک کر گاتے تھے

زنانہ آواز دل دامن کا متوالا ہے
آنچل کی بات نہ ہم سے کہو......

......ہلکی موسیقی اور فیڈ آوٹ......

راوی: سعادت حسن منٹو کی میرا جی سے کافی بے تکلفی تھی......میرا جی کھل کر منٹو سے اپنی بات کہتے تھے......بقول منٹو......

(ہلکی ہلکی موسیقی کے پسِ منظر میں)

منٹو: بحیثیت شاعر کے میرا جی کی حیثیت وہی ہے جو گلے سڑے پتوں کی ہوتی ہے جیسے کھاد کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے، میں سمجھتا ہوں اس کا کلام بڑی عمدہ کھاد ہے جس کی افادیت ایک نہ ایک دن ضرور ظاہر ہو کے رہے گی، اُن کی شاعری ایک گمراہ کن انسان کا کلام ہے جو انسانیت کی عمیق ترین پستیوں سے متعلق ہونے کے باوجود دوسرے انسانوں کے لئے اونچی فضاؤں میں مرغ بادِنما کا کام انجام دے سکتا ہے......بحیثیت شاعر وہ بڑا دلچسپ تھا......

ہلکی موسیقی......!

میراجی: کیوں منٹو بھیا......کس بات پر مسکرائے......

منٹو: یہ تم نے کیا صورت بنا رکھی ہے......لمبے لمبے غلیظ بال جو گردن سے نیچے لٹک رہے ہیں، فرنچ کٹ سی داڑھی......میل سے بھرے ناخون......اور پھر......

میراجی: اور کیا

منٹو: گلے کی مالا اور تین آہنی گولے......

دونوں ہنستے ہیں......

ہلکی موسیقی......

منٹو: میراجی نے شاعری کی بڑے خلوص کے ساتھ شراب پی بڑے خلوص کے ساتھ......بھنگ پی بڑے خلوص کے ساتھ، لوگوں سے دوستی کی، دوستی کو نبھایا، اپنی زندگی کی ایک عظیم ترین خواہش کو جُل دینے کے بعد وہ کسی اور سے دھوکہ فریب کرنے کا اہل ہی نہ رہا......وہ دیکھے بغیر آگے نکلتا رہا کسی ایسی جگہ جس کی کوئی سمت نہیں...... مجھے یاد آرہی ہے اُن سے ایک ملاقات......

ہلکی موسیقی ابھرتی ہے......

منٹو: میراجی آپ نے میرا سین سے کبھی اپنے عشق کا اظہار کیا۔

میراجی: منٹو صاحب......کیا کہوں آپ سے......اس کا کبھی موقع ہی نہ ملا

منٹو: آپ نے کوشش تو کی ہوگی۔

میراجی: کوشش کی منٹو بھائی

منٹو: کیسی کوشش

میراجی: ہم نے ایک بار فیصلہ لیا کہ میرا سین سے بات کریں گے ہم نے خوب سوچا......ہم نے سوچا اگر اس نے انکار کیا تو اس کو یوں قائل کردیں گے۔ اگر اقرار کیا تو یوں پروگرام بنائیں گے، اچھی طرح سے ہر نقطے پر سوچنے

کے بعد ہم اس کے پاس گئے......ہم نے بات کی۔

منٹو: پھر

میراجی: ہماری بات سن کر وہ خاموش رہی...... بالکل نہ بولی منٹو بھائی

منٹو: تو پھر

میراجی: پھر ہم چلے آئے

منٹو: (حیران ہو کر) کیوں

میراجی: کیونکہ یہ ہم نے سوچا ہی نہ تھا......

(ہلکی ہلکی موسیقی......!!)

زنانہ آواز: کہا جاتا ہے کہ میراجی میرا سین کے نام وقتاً فوقتاً خط بھی لکھتے رہے یہ خط میرا سین تک شاید کبھی نہ پہنچے...... میں نے اسے ایک خط......

میراجی: میرا سین...... یہ تم میری موت کا سامان کر رہی ہو، اگر میری خوشی کی کوئی صورت نہیں تو کم سے کم اتنا تو کرو کہ ایسی باتیں مجھے سناؤ جن سے حوصلہ بڑھے اور میں بڑے سے بڑا دکھ ذرا آسانی اور کم اذیت سے سہہ سکوں...... اوخدا......کبھی آنسو پلکوں پر رکھے رہتے تھے اور اب یہ ظالم سخت سے سخت اذیت دے رہے ہیں ایک بوند بھی نہیں نکلتی......مجھ پر مہربانی کر چند آنسو بہا دے کہ دل ہلکا تو ہو جائے......!

ہلکی ہلکی موسیقی ابھرتی ہے

راوی: اور اب میراجی کی کتاب پریشانی سے ایک ورق...... یہ نومبر ۱۹۴۴ عیسویں کی تحریر ہے......! میراجی سنا رہے ہیں......

میراجی: کسی زمانے میں ہر شخص اپنی محنت مشقت کے بل پر زندگی کے دن کاٹ سکتا تھا آخر ایک فرد دوسرے فرد سے ایک قوم دوسرے قوم سے اور ایک ملک دوسرے ملک سے دور اور بے نیا ہونے کے باوجود امن و آسائش کے لئے ایک دوسرے کا محتاج ہے۔

میں ڈرتا ہوں مسرت سے
کہیں یہ میری ہستی کو
بُھلا کر تلخیاں ساری
بنادے دیوتا سا
تو پھر میں خواب ہی بن کر گزاروں گا
زمانہ اپنی ہستی کا......!!!

......ہلکی موسیقی......

راوی: میراجی نے مختلف زبانوں کے شاعروں کے بارے میں مضامیں بھی لکھے اوران مضامین میں اُن شاعروں کے کلام کے ترجمے نمونے کے طور پر شامل کیئے، ان مضامین کو پڑھ کر جہاں ایک طرف میراجی کے قلم کی قوت کا احساس ابھرتا ہے وہیں دوسری طرف ان کی شخصیت اور شاعری کی روح کی نشوونما کے مطالعہ کے لئے ہماری مدد کرتے ہیں۔
ہلکی موسیقی کے پسِ منظر میں میراجی کی آواز......

میراجی: جب تک ہے زمین
جب تک ہے زماں
یہ حسن ونمائش جاری ہے
اس کی ایک جھلک......
دیکھ کے جی بھرنے دو

راوی: دیکھئے اس تعلق سے ڈی ایچ لارنس کی ایک نظم کا عکس...... میراجی کے قلم سے

زنانہ آواز: یہ وحشی لہریں کیا کہتی ہیں
لہریں جو ہر دم بہتی ہیں
بہتے بہتے یہ کہتی ہیں
انسانیت کیسی شامت ہے......اپنے لئے بے وجہ زحمت ہے

......ہلکی موسیقی اور فیڈ اوٹ......

راوی: میرا جی کہا کرتے تھے......

میرا جی: میری نظمیں صرف ان لوگوں کے لئے ہیں جو انہیں سمجھنے کے اہل ہوں یا سمجھنا چاہتے ہوں اور اس کے لئے کوشش کرتے ہوں

زندگی محبوب ہے پھر بھی دعائیں موت کی
مانگتا ہے دل میرا دن رات کیوں......
کیوں نگاہوں پر مرے چھائے ہیں آنسو بے نقاب
اس سوالِ مستقل کا کیوں نہیں ملتا جواب......

زنانہ آواز: میرا جی کی زندگی کے آخری لمحوں میں اختر الایمان ان کے قریب تھے بلکہ بیماری کے دنوں میں وہ ان کے گھر میں ہی رہتے تھے......پھر بیماری نے شدت اختیار کی انہیں جگر کی بیماری تھی اختر الایمان ہاسپٹل لے گئے......وہ روز ہی انہیں ہاسپٹل دیکھنے جایا کرتے تھے، معروف کہانی کار مہندر ناتھ نے اپنا خون بھی دیا......لیکن علاج کی ہر کوشش الٹ ہو رہی تھی

......ہلکی موسیقی کے پسِ منظر میں......

میرا جی: دیکھو اختر، یہ لوگ مجھ سے میرے Complexes نکالنا چاہتے ہیں، میں ایسا نہیں چاہتا، میں ایسا نہیں ہونے دوں گا...... یہ نکل گئے تو میں کیسے لکھوں گا، کیا لکھوں گا۔ یہ Complexes ہی تو میری تحریریں ہیں۔

بہت ہی غمزدہ موسیقی ابھرتی ہے......

راوی: میرا جی انتقال کر گئے......

انا للہ و انا الیہ راجعون...

میرا جی...... میرا جی کی موت...... ایک دور کی موت...... ایک اثاثے کی موت انتقال کے بعد میرا جی کے چہرے پر وہی عظمت، وہی محبت، وہی معصومیت، وہی اطمینان وسکون تھا کہ نگاہوں کو کسی طرح بھی یقین نہیں آتا

تھا کہ میراجی ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے ہیں۔

افسردہ موسیقی کی ایک اور لہر

راوی: اور اس عظیم شاعر کے جنازے میں ممبئی جیسے بڑے شہر میں، جانتے ہیں آپ کتنے لوگ شامل ہوئے تھے......صرف چار...... اور اُن چار میں سے ایک اختر الایمان تھے......

زنانہ آواز: میراجی ہم سے کبھی الگ نہیں ہو سکتے ہیں...... وہ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گے...... ہماری یادوں میں ہماری سوچوں میں...... ہماری کتابوں میں......!!



افسانچے

خالد حسین

وریندر پٹواری اور وحشی سعید کی نذر!

پھر کیا؟

''آپ بہت خوبصورت ہیں''

''جی شکریہ''

''آپ کو اپنوں، غیروں یا اجنبیوں سے ملنے جلنے میں کوئی اعتراض تو نہیں''

''بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے''

''رقص و موسیقی سے کوئی لگاؤ''

''جی ہاں کسی حد تک''

''شعر و شاعری......''

''عشق و محبت کے بہت سارے اشعار یاد ہیں''

''پینے پلانے میں کوئی دلچسپی''

''انکار نہیں کرتی''

''لینے دینے میں کوئی جھجک''

''وقت ہی فیصلہ کرے گا''

''تو پھر''

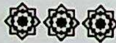
''پھر کیا''

''آج سے آپ ہماری کمپنی کی نئی پی آر اُو ہیں، یعنی پبلک ریلیشن آفیسر...... ہمارے کئی کام مختلف دفتروں میں مختلف لوگوں کے پاس اٹکے ہوئے ہیں، اب آپ کے آنے سے ہماری ساری مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔!!!''

کیا روپ کیا سروپ

اور پھر جب عنایت نے چھ برس بعد اپنے گھر کے آنگن میں قدم رکھا تو دور ونزدیک کے بہت سارے ہمسائے اُس کے باپ کو غسل دے رہے تھے اور دفنانے کے لئے انتظامات میں مصروف تھے، عنایت کی اچانک آمد پر اُن کے چہروں پر ایک انجان سی خوشی ٹپکنے لگی کہ اپنے باپ کی میت کو کاندھا دینے کے لئے آخر اُس کا بیٹا آ ہی گیا۔ اِس دنیا میں سالہا سال اکیلے پن کی تپش میں جلنے کے بعد اب شاید دوسری دنیا میں اُس کی روح کو سکون میسر ہوگا۔ عنایت نے کندھے پر لٹکے ہوئے بیگ کو نیچے رکھ کر کھولا اور اُس میں سے اپنا کیمرہ نکال کر میت کی تصویریں لینے لگا۔ تصویریں لینے کے بعد کیمرے کو دوبارہ بیگ میں ڈال دیا۔

Very sad but you please carry on...... میں اِن تصویروں کو اپنے بچوں کو لندن میل کروں گا۔ اپنے گرینڈ پاپا کی تصویریں دیکھ کر وہ خوب enjoy کریں گے۔!!!



تجربہ

وہ دونوں خوبصورت تھے بے حد خوبصورت اور ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتے تھے اُن دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر محسوس ہوتا کہ ایک دوسرے کے بغیر اُن کا جینا مرنا شاید ناممکن تو نہیں مشکل ضرور ہے۔ عالیہ کے گلابی گلابی، ملائم ملائم گال، کشمیری سیبوں کی مٹھاس سے بھرپور سُرخ سُرخ ہونٹ، بڑی بڑی بادامی آنکھیں، کالی کالی زلفیں اور گورا گورا سڈول جسم اُس کی سندرتا میں اضافہ کرتے تھے، اختر علی بھی قدوقامت اور خدوخال سے مالا مال تھا۔ مضبوط توانا جسم، مخمور آنکھیں اور لمبے گھرے سنہرے بال اُس کی خوبصورتی کا ایک حصہ تھے۔ وہ ایک بڑے سرکاری عہدہ پر فائز تھا، رہنے کے لئے سرکاری گھر، گھومنے پھرنے کے لئے سرکاری گاڑی، گھر اور گھریلو کام کے لئے سرکاری نوکر، ہر شئے میسر تھی اُن کے لئے اُن کے گھر کے لئے۔ عالیہ خود بھی ایک پروڈکشن کمپنی سے وابستہ تھی۔ اُن کی شادی ہوئے اب دس برس ہو چکے تھے اور اِن دس برسوں میں شاید ہی ایسا کوئی لمحہ گزرا ہوگا جب اُن دونوں کی محبت، اُن کی شفقت اور اُن کے پیار واعتماد کو کبھی کوئی ٹھیس لگی ہو لیکن اِس بے پناہ پیار ومحبت کی دنیا میں وہ کائنات کی سب سے بڑی نعمت اور زندگی کی سب سے بڑی ضرورت اولاد سے محروم تھے۔

''دیکھو اختر'' ایک شام عالیہ نے کہا۔ ''تم دوسری شادی کرلو، آخر کوئی تو چاہئے اتنی بڑی جائداد کو سنبھالنے اور سمیٹنے کے لئے''

''میں دوسری شادی نہیں کرسکتا، ایسا ممکن بھی نہیں ہے'' اختر نے کہا

''ایسا کیوں ممکن نہیں، میں تمہیں اجازت دے رہی ہو...... اور یقین کرو اختر میں

اسی طرح تم سے پیار کرتی رہوں گی ......"

"عالیہ میں اپنی کمزوری سے واقف ہوں۔ڈاکٹر کہتے ہیں کہ میں بچہ پیدا نہیں کرسکتا...... لیکن میں کئی روز سے ایک اور بات سوچ رہا ہوں"

"کیا سوچ رہے ہو اختر"

"تم سے کہتے ہوئے ڈر سا لگ رہا ہے"

"ڈر کیوں اور کس بات سے"

"تم ...... تم گھر کے کسی نوکر یا کسی دوست سے ...... کسی کو پتہ نہیں چلے گا اور بدنامی بھی نہ ہوگی؟!"

اور عالیہ من ہی من میں سوچنے لگی ......"اب میں اختر کو کیسے بتاؤں کہ میں اس تجربے سے پہلے ہی گزر چکی ہوں"۔!



ڈیوٹی

شہر خاص میں نئے افسر اعلیٰ کے آنے سے بالائی آمدنی کے قریب قریب سارے دروازے بند ہونے لگے، بالائی آمدنی حاصل کرنے والوں کی نیندیں اُڑ کر رہ گئیں اور وہ نئے دروازے تلاش کرنے لگے۔ جہاں چاہ ہے وہاں سوچ بھی ہے، اپنے پولیس سٹیشن کے انچارج غفور صاحب کے ذہن میں ایک نئی سوچ نے جنم لیا، دراصل اس سوچ میں چاہ پوشیدہ تھی۔ اُس نے ایک جیب کترے کو حوالات کی سلاخوں سے باہر نکال کر اپنی سوچوں کا حصہ بنایا۔ تجرباتی طور پر اُس نے جیب کترے کو ایک دن کے لئے اس لئے رہا کیا کہ وہ دن بھر لوگوں کی جیبیں کاٹنے کے بعد ایک بار اپنے گھر والوں سے بھی مل سکتا ہے لیکن شام اُترنے سے پہلے ہی اُسے ہر حالت میں لوٹ کر آنا ہوگا...... دن بھر کی کمائی کے ساتھ۔ جیب کترہ طے شدہ پروگرام کے مطابق پولیس سٹیشن سے باہر آیا اور سڑکوں پر اِدھر اُدھر گھومنے پھرنے لگا۔ گھومتے پھرتے اپنے شکار کی تلاش کرتا رہا اب شکار اُس کی نظروں میں آچکا تھا۔ وہ شخص بنک سے نکل کر میٹاڈار میں سوار ہوگیا۔ وہ بھی اُس کا ہم سفر بن گیا وہ نہایت احتیاط لیکن اعتماد کے ساتھ اُس کی جیب سے پرس نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ دوسرے بس سٹاپ پر وہ میٹاڈار سے نیچے اُتر آیا، پرس کھول کر دیکھا اُس میں پورے دس ہزار روپے تھے۔ یہ رقم دیکھتے ہی اُسے اپنے گھر کا خیال آیا اور گھر کی جانب چل پڑا۔ گھر والے اُس کی بے وقت آمد سے حیران رہ گئے، اُس نے خاموشی سے پانچ ہزار کی رقم اُن کے سپرد کر دی اور شام اُترنے سے پہلے ہی پولیس سٹیشن میں حاضر ہوگیا۔ غفور صاحب نے مسکراتے ہوئے پانچ ہزار کی رقم جیب میں ڈال دی اور پرس کو ڈسٹ بن میں پھینک

دیا۔ وہ بالائی آمدنی حاصل کرنے کی اپنی اسکیم پر بہت مسرور نظر آرہا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک شخص پولیس سٹیشن میں یہ شکایت درج کرنے کے لئے حاضر ہوا کہ اس کا پرس کسی جیب کترے نے اُڑا لیا ہے اور اُس میں پورے دس ہزار روپے کی رقم تھی۔ غفور صاحب نے پہلے ایف آئی آر درج کرنے سے انکار کیا لیکن جب اُس شخص نے افسرِ اعلیٰ کے سامنے شکایت کرنے کا اپنا ارادہ ظاہر کیا تو غفور صاحب نے بے دلی سے ایف آئی آر درج کیا اور پورے معاملے کی سنجیدگی کے ساتھ جانچ پڑتال کرنے کا وعدہ بھی کیا، وہ شخص جب چلا گیا تو غفور صاحب اپنے جلال میں آئے اور جیب کترے کو بُلا کر اُس پر برس پڑے۔

''اتنی بڑی جلسازی، اتنا بڑا دھوکہ...... میرے ساتھ...... دس ہزار میں سے پانچ ہزار کی رقم اڑالی...... دیکھ اب میں تیرا کیا حشر کرتا ہوں۔''

لیکن دوسرے ہی لمحے اُس کے لہجے میں نرمی آگئی۔

''اب کی بار معاف کرتا ہوں۔ آئندہ ایسی غلطی نہ کرنا...... اب جا کر کھانا کھالو اور سو جاؤ...... کل پھر تمہیں ڈیوٹی پر جانا ہوگا......!''



انتظار

دیکھو نائلہ میں گھر سے باہر جارہا ہوں۔ دیر ہوسکتی ہے لوٹ کر آنے میں رات بھی لگ سکتی ہے، تم بالکل نہ گھبرانا...... دراصل ایک بہت ضروری کام آن پڑا ہے، دوستی نبھانے کا معاملہ ہے، میں اپنے ایک دوست کے ہاں جارہا ہوں، میرا وہ دوست محکمہ اکسائز میں کام کرتا ہے، دوسرے درجے کا ملازم ہے لیکن ہے بڑا شاطر اور چالاک، ہر کام میں ماہر ہے۔ وہ مجھے افیم سے بھرا ایک پیکٹ دے رہا ہے، وہ پیکٹ میں اس کے افسر کے گھر چھوڑنے جارہا ہوں، کوئی بہانہ بنا کر میں اس کے گھر کے اندر چلا جاؤں گا تم تو جانتی ہو کہ بہانے بنانے مجھے بخوبی آتے ہیں...... سنو تو سہی، اس آفسر نے میرے دوست کی ترقی روک رکھی ہے، کیونکہ اُنہیں میرے دوست کے خلاف کافی شکایتیں مل چکی ہیں جن کی وہ چھان بین کررہا ہے...... ہاں ہاں شکایتیں درست ہیں بڑا چاپلوس قسم کا آدمی ہے میرا دوست...... رشوت لئے بغیر کوئی کام نہیں کرتا...... میری بات تو سنو، آفسر کے گھر افیم کا پیکٹ ڈالنے کے فوراً بعد میں تو چلا آؤں گا لیکن میرا دوست پولیس کی مدد سے وہ پیکٹ برآمد کر کے اُس آفسر کو...... باقی کہنے کی ضرورت نہیں، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں، تم سمجھ گئی نا ارے نا سمجھ، آفسر پکڑا جائے گا افیم رکھنے کے جرم میں...... ہاں چلتا ہوں اب...... تم بالکل نہ گھبرانا۔

ابھی وہ اپنے گھر سے دو قدم بھی نہ چلا تھا کہ ایک گلی سے چند سپاہی نمودار ہوئے، افیم کا پیکٹ برآمد کیا گیا اور افیم کا کاروبار کرنے کی جرم میں مزید پوچھ تاچھ کے لئے پولیس سٹیشن لیا گیا...... اِدھر اس کا شاطر اور چالاک دوست دوسری گلی سے نمودار ہوا، اپنے ایک

ہاتھ میں گل دستہ اور دوسرے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھامے اُس کے گھر میں داخل ہونے لگا جہاں نائلہ بے صبری سے اس کا انتظار کررہی تھی۔!!!



نصیحت

جب خالد کو ایک بڑے شہر میں ایک بڑی کمپنی میں اچھی خاصی ''سروس'' ملی تو اُس نے اپنے والد محترم کو اِس کی اطلاع دی، والد محترم یہ جان کر زیادہ ہی خوش ہوئے کہ اُن کے بیٹے کو رہنے کے لئے ایک بنگلہ ملا ہے اور گھومنے پھرنے کے لئے کار بھی۔ بھلا ایک باپ کے لئے اس سے بڑھ کر کیا خوشی ہوسکتی تھی۔ لیکن کچھ سوچنے کے بعد اُس نے اپنے بیٹے کو لکھا۔ ''میرا مالک تمہیں دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی دے لیکن بیٹا اپنے نئے شہر میں گھر کے دروازے پر تم ایسا کوئی چوکیدار نہ رکھنا جس سے ڈر کر ہمیں بھی تم سے ملے بغیر لوٹ کر آنا پڑے۔!!''



واپسی

''شینو سنا ہے کہ تمہارے پاپا واپس آنے والے ہیں۔''

''ہاں، پورے دس برس بعد''

''مبارک ہو، پھر تو اُن کا خاطر خواہ استقبال ہونا چاہئے کچھ سوچا ہے اس بارے میں''

''ہاں، ایک تو پورے گھر کو نیا رنگ روپ دیا جا رہا ہے، ہر کمرے کو پینٹ کیا جا رہا ہے، لان کو نئے نئے خوش رنگ پھولوں سے سجایا جا رہا ہے، کھڑکیوں کے پردے بدلے جا رہے ہیں اور بھی بہت کچھ کیا جا رہا ہے تا کہ پاپا کو سب کچھ نیا نیا سا لگے۔ایک سرپرائز بھی دینا چاہتی ہوں''۔

''سرپرائز دینا چاہتی ہو''۔

''ہاں ہاں......لیکن وہ سرپرائز شاید انہیں پسند نہ آئے۔''

''کیوں......ایسا کیا ہے''

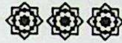
''وہ......سرپرائز کمار انکل کے روپ میں ہوگا جواب دو سال سے ہمارے گھر میں رہ رہے ہیں، مما کے دوسرے ہسبنڈ کے روپ میں''......!



خاموشی

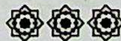
گھر کی تیسری منزل سے میں اکثر اپنی آنکھوں سے اپنے ہمسائے کے بڑے آنگن میں جھانکتی رہتی ہوں، پھر اچانک میری آنکھوں میں بادل اُمڈ آتے ہیں اور برسنے لگتے ہیں، ان برستے بادلوں کی اُوٹ سے ایک سایہ اُبھرنے لگتا ہے، یہ سایہ اپنے آپ سے بے خبر لگتا ہے جیسے اُس کی زندگی راکھ بن چکی ہو، پھر نہ جانے کیسے اِس راکھ سے شعلے بلند ہوتے ہیں اور یہ شعلے عثمان کی صورت میں اپنے ارد گرد روشنی بکھیرنے لگتے ہیں......عثمان میری محبت، میری زندگی لیکن میری یہ محبت اب نہ جانے اس بڑے آنگن کے کس گوشے میں گم ہو چکی ہے، خود میری زندگی بھی نہ جانے کب آنسو بن کر تحلیل ہو چکی ہے۔ پھر مجھے کس کا انتظار ہے، کس لئے، کیوں میں روز اس آنگن میں جھانکتی رہتی ہوں؟ کیوں میری آنکھوں میں بادل اُمڈ آتے ہیں اور برس کر مجھے بے چین کر دیتے ہیں؟ وہ تو اب نہیں آئے گا، کبھی نہیں آئے گا،...... ہاں جب کرفیو نے شہر کو نگل لیا تھا اور دور سے آتی ہوئی ایک گولی نے اس بڑے آنگن کو چھو کر عثمان کے سینے کو چھلنی کر دیا تھا۔ وہ تو معصوم تھا، بے گناہ تھا، بے قصور تھا۔ جب گولی چلنے کی آواز آئی تھی تب وہ اپنے آنگن میں پھولوں کی کیاریوں کو پانی دے رہا تھا، اُنہیں سیراب کر کے زندگی دینے کی کوشش کر رہا تھا اُن کی خوشبو سے اپنے وجود کو معطر کرنا چاہتا تھا۔ کرفیو ہونے کی وجہ سے وہ اُس روز یونیورسٹی نہ جا سکا تھا۔ آج تک یہ ساری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں، میں اس تعلق سے سوچتی رہتی ہوں، بہت سوچتی رہتی ہوں پر میری مشکل آسان نہیں ہوتی، خدارا میری مدد کیجئے مجھے بتا دیجئے ایسا کیوں ہوا، کس لئے ہوا، عثمان کا آخر قصور کیا تھا، وہ کیوں بے گناہ اور بے قصور مارا گیا، کیوں اُس کی کتابوں

کی دنیا چھین لی گئی......اور اب اتنے برس بیتنے کے بعد میرے وجود کے گنبد پر یہ کسی آواز سنائی دے رہی ہے؟ کس کی آواز ہے یہ، کون میرے تخیل کے پردے پر اُڑتے ہوئے پرندے کو گھائل کر رہا ہے، اس بڑے آنگن میں بے سمتی کی دُھند میں کیوں رینگ رہی ہوں۔ بتائے نا؟ کیا یہ سب کچھ صرف میرے ساتھ ہوا ہے، کیا یہ درد صرف میرے حصے میں آیا ہے یا آپ بھی میری ہی طرح اس بے سمتی کے دُھند میں رینگ رہے ہیں، اِس درد سے تڑپ رہے ہیں۔ آپ خاموش کیوں؟!



آکاش اور دھرتی

اور وہ اُونچی لمبی دیوار کے سہارے پیتل اور لوہے کی لمبی تار اُتار نے درخت کے آخری سرے تک پہنچ گیا مگر درخت کی وہ شاخ جس کو اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر رکھا تھا اچانک ٹوٹ گئی اور وہ بے ساختہ زمین پر گر پڑا اور بے ہوش ہوتے ہوتے کبھی ہوش میں نہ آیا۔ اگر زمین کی پستیاں اُسے جیتے جی اپنا لیتیں تو وہ اتنی بلندی پر اپنے رزق کی تلاش نہ کرتا......!!



جگمگاتے اندھیرے

شہر کے چیدہ چیدہ شاہراؤں پر جب پیلی، لال اور سبز بتیاں رُک رُک کر، ٹھہر ٹھہر کر جگمگانے لگتی ہیں تو اسی انداز سے اِن شاہراؤں پر چلنے والی دو پہیوں اور چار پہیوں والی گاڑیوں میں حرکت آجاتی ہے اور پھر ہر سمت ایک گہما گہمی اور برق رفتاری کا احساس جاگ اُٹھتا ہے لیکن......لیکن ذراسی دوری پر چند وردی پوش دو پہیوں اور چار پہیوں والی گاڑیوں کو رُوک رُوک کر اپنے گھروں میں چولھے جلائے رکھنے کی خاطر کاغذات کی جانچ پڑتال کرنے میں مصروف نظر آنے لگتے ہیں۔



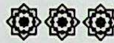
اعتبار

''وومن ڈے'' کے تعلق سے ایور گرین پارک میں ایک نمائش کا اہتمام کیا گیا تھا مختلف غیر سرکاری تنظیموں نے مختلف اسٹال سجا رکھے تھے اور ہنڈی کرافٹ کے اعلیٰ نمونے ہماری میراث کو دہرا رہے تھے، سارا پارک خواتین سے بھرا ہوا تھا بڑے صاحب آئے، سرخ رنگ کا فیتہ کاٹا، اسٹالوں میں گھومے پھرے، تھوڑی بہت خریداری بھی کرلی اور پھر سٹیج پر آکر بھاشن دینے لگے۔ خواتین کی عظمت کی باتیں کرنے لگے، خواتین کو حقوق حاصل کرنے کے لئے اپنی بھرپور حمایت کا اعلان کرنے لگے اور پھر جوش میں آکر پورے ہوش میں کہہ دیا کہ اُنہوں نے اپنی زندگی خواتین کی بہتری، بھلائی اور بہبودی کے لئے وقف رکھی ہے، یہی وجہ ہے کہ اُن کے گھر کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے ہیں اور کوئی بھی خاتون بلا خوف وجھجک اُن سے ملنے آسکتی ہے۔ وہاں پہرہ ہے اور نہ ہی پہرہ دار......اور جب دوسرے تیسرے دن ایک خاتون اپنی بیٹی کو نوکری دلانے کی خاطر اُن سے ملنے اُن کے گھر کے اندر چلی گئی تو کچھ ہی دیر بعد اُسے پہرہ اور پہرہ داری کی بات سمجھ میں آگئی......!!



انوکھے کھیل

جب وہ پیدا ہوا تو گوروجی نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا تھا ''یہ بچہ بہت خوش نصیب ہے، اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ نام پائے گا اور بڑی بات یہ کہ لمبی عمر بھی پائے گا...... دیکھئے اس کے ہاتھ کی لکیریں اور یہ لمبی عمر کی لکیر میری بات کی تصدیق کر رہی ہے۔'' اور ایک روز جب وہ بچہ آٹھویں برس میں قدم جما چکا تھا، اسکول سے گھر لوٹتے وقت ایک تیز رفتار کار کی زد میں آ گیا اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ جب اُس کی لاش اُس کے گھر لائی گئی تو ماں کی نظریں سب سے پہلے اُس کے ہاتھ کی لکیروں پر اٹک گئیں، لمبی عمر کی لکیر اب بھی موجود تھی......!!!



خالق

وہ ایک سنگتراش تھا، اپنی سوچوں کے سہارے اور اپنے ہاتھوں کی مدد سے بڑے بڑے پتھروں کو تراش تراش کر خوبصورت اور سندر مورتیوں میں تبدیل کر دیتا، لوگ اِن مورتیوں کو خرید کر اپنے گھروں میں سجاتے، اِن کو دودھ سے نہلاتے، بڑی محبت اور عقیدت کے ساتھ اِن پر پھول نچھاور کرتے۔ لوگوں کی نظروں میں وہ نہ صرف ایک عظیم فنکار اور سنگتراش تھا بلکہ ایک اعلیٰ ذات کے ہندو گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ شہر کے بڑے مندر کے پجاری کا اکلوتا بیٹا بھی تھا۔ دھرم نہ صرف ظاہری طور پر بلکہ پیدائش سے ہی اُس کے خون کا حصہ تھا...... لیکن اس بات سے کوئی واقف نہ تھا کہ وہ ایک ناستک ہے۔!!



فرض شناسی

منی آج بھی رو رہی تھی!

''دیکھو منی''۔ ماں نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا...... ''تمہارے ابو جان اِن دنوں بھونچال سے متاثر لوگوں کی دیکھ بھال کرنے میں مصروف ہیں، بہت سارے لوگ بے گھر ہو چکے ہیں، اُن کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کے بہت سارے انتظام کرنے پڑتے ہیں تیرے ابو، ریلیف کمیٹی کے صدر ہیں، راحت کے کاموں سے اُنہیں فرصت تو ملنے دو...... اب سو جاؤ میری اچھی منی!''

منی نے روتی ہوئی نگاہوں سے اپنی ماں کی جانب دیکھا اور اپنے معصوم سے لہجے میں کہا۔''امی میں یہ نہیں مان سکتی...... کل تو ابو دو کنستر گھی اور ایک بوری آٹا لائے تھے اور آج وہ چھ نئے کمبل لائے ہیں، لیکن میری گڈیا لانا بھول گئے۔!''



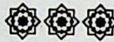
آخری سٹیج

وہ ایک لڑکی تھی اُجلی اُجلی سی، بھیگی بھیگی سی، بڑی سندر، بڑی نٹ کھٹ، اپنے نام کی تشہیر کے لئے ہر محفل میں نظر آتی تھی اور اپنے شوخ بیانی سے ہر محفل میں چھا جاتی تھی، کبھی سٹیج اور کبھی شیشے کے سکرین پر نظر آتی تھی، کبھی ریڈیو کی آواز بنکر کانوں میں قطرہ قطرہ شہید گھولتی تھی لیکن اب بہت دنوں سے نظر نہیں آ رہی تھی جیسے پنکھ لگا کر آسمان کی وسعتوں میں غائب ہو چکی ہو...... ہاں اس کا ایک ساتھی کسی سے کہہ رہا تھا۔''وہ ماں بننے والی ہے!''



مذہب اور زبان

اپنے فکر ونظر اور اپنی سوچ وفکر سے ہر مذہب، ہر دھرم کی اپنی اہمیت اور افادیت ہوتی ہے۔ کسی بھی زاویئے سے کسی بھی مذہب یا دھرم کی عظمت اور برتری سے ہرگز ہرگز انکار کی گنجائش نہیں ہوسکتی ہے ہم کسی بھی مذہب یا دھرم سے تعلق رکھتے ہوں، کسی بھی سوچ میں یقین رکھتے ہوں، کسی بھی فلسفہ حیات کو قبول کرتے ہوں لیکن ہم یہ بات فراموش نہیں کر سکتے کہ کسی بھی زبان کو سمجھنے کے لئے مذہب یا دھرم کی ضرورت ہو یا نہ ہو لیکن کسی بھی مذہب یا دھرم کو سمجھنے کے لئے کسی نہ کسی زبان کی ضرورت ہوتی ہے؟



وارث

شکل وصورت، عادات واطوار، خاندان اور نسل وخون، تعلیم وتربیت، سماجی رُتبہ، مالی خوشحالی......سب کچھ جانچنے اور پرکھنے کے بعد ہم نے کلثوم کو اپنی بہو بنانے کا فیصلہ کر لیا......ہاں کہہ دی، شادی ہوگئی......اب سات برس ہونے کو آئے لیکن کلثوم آج بھی لذت تخلیق سے ناآشنا ہے اور ادھر ہمیں اپنی بکھری ہوئی جائداد کو سمیٹنے کے لئے ایک وارث کی ضرورت ہے......قدرت کے کھیل کتنے انوکھے ہیں۔!!



آج اور کل

بزرگ باپ نے اپنے بیٹے کو نصیحت آمیز لہجے میں کہا...... ''بیٹا اپنے پرس میں فوٹو اور اپنا مکمل ایڈریس رکھنا بڑی اچھی عادت ہے، چند برس قبل جب میرا ایکسی ڈنٹ ہوا تھا تو لوگ میرا فوٹو اور ایڈریس دیکھ کر مجھے بحفاظت گھر لائے تھے......'' بیٹے نے ایک قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا...... ''پاپا آپ نہ جانے کس زمانے کی بات کر رہے ہیں، آج تو لوگ فوٹو اور ایڈریس دیکھے بغیر ہی پرس غائب کر دیتے ہیں۔!!''



ایک کہانی کے تین روپ:

پہلا روپ

''ایک کلو گوشت''

''یہ لیجئے''

''کتنا ہوا''

''تین سو پچاس روپیے''

''مہنگا ہے''

''ہو سکتا ہے، پر ہے نا گوشت ہی اور وہ بھی بکری کا تروتازہ''

''جی ہاں واقعی گوشت ہی ہے''

دوسرا روپ

''دو درجن سنگترے''

''یہ لیجئے''

''کتنا ہوا''

''پچاس روپیے''

''مہنگے ہیں''

''مہنگے ہو سکتے ہیں، پر ہیں نا سنگترے ہی اور وہ بھی ناگپوری تروتازہ''

''جی ہاں، وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں''

تیسرا روپ

''دوائی دیجیے''

''یہ لیجیے''

''کتنا ہوا''

''چھ سو بیالیس روپے''

''بڑی مہنگی دوائی ہے، جانے ان دنوں ڈاکٹر اتنی مہنگی دوائی کیوں تجویز کرتے ہیں''

''یہ تو ڈاکٹر ہی بتا سکتے ہیں، میرا کام ہے پیسے لینا اور دوائی دینا......اور پھر دوائی مہنگی ہو یا سستی، آخر دوائی ہی تو ہے، آپ کی ہم سب کی بیماری کا علاج''

''جی ہاں، جانتا ہوں...... پر......!''

''پر کیا''

''یہ دوائی نقلی ہے یا اصلی، اِس کی کیا گارنٹی ہے''



انعام

یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں!

اِس جانب لوگوں کا ایک بڑا ہجوم، لوگوں کا پُرزور احتجاج...... بے خوف آوازیں......"ہم کیا چاہتے ہیں، جینے کا حق۔!"

اُس جانب بھی ایک ہجوم، قطار در قطار وردی پوش، ہاتھوں میں بندوق تھامے......!!

اور اِن دونوں سے ذرا دور، ایک خاموش خاموش سے کمرے میں چند لوگ اپنے کام میں مصروف...... کاغذات کا ایک انبار...... انتظامی سہولیت کے پیشِ نظر مرنے والوں کے مرنے سے پہلے وارثوں کے لئے پیشگی چیک تیار کر رہے ہیں۔!!!



تیرا میرا کیا رشتہ

سنٹرل کراسنگ سے ذرا دوری پر اُس کا سکوٹر موڑ کاٹتے ہوئے ایک اسکولی بس سے ٹکرا گیا ٹکراتنی زبردست تھی کہ وہ سڑک پر بہت دور جا گرا۔ بس کا ڈرائیور رُکنے کی بجائے گاڑی کی رفتار کو بڑھاتے ہوئے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ ادھر سنٹرل کراسنگ پر خون سے لت پت اُس کی جانب توجہ دیئے بغیر ٹریفک معمول کی طرح بھاگتا رہا، البتہ چند راہ گیر رُک گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ سڑک پر پڑے شخص کے سر سے بے تحاشا خون بہہ رہا ہے۔ دفعتاً ایک آواز آئی ...... ''ہاسپٹل ...... ہاسپٹل لے جانے سے شاید اس کی جان بچ سکتی ہے۔'' وہ گاڑیوں کو روکنے کی کوشش کرنے لگے۔ بڑی مشکل سے ایک کار ٹھیک اُن کے سامنے رُک گئی۔ کار کا مالک باہر آیا۔ ایک راہ گیر نے کار مالک سے لفٹ دینے کے لئے استدعا کی تاکہ زخمی شخص کو ہاسپٹل پہنچایا جاسکے۔ کار مالک نے خون سے لت پت نیم مردہ جسم پر ایک نظر ڈالی، پھر اپنی کار کی جانب دیکھا اور خاموشی سے اندر جا بیٹھا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''میں ایسا نہیں کرسکتا۔ میری یہ کار بالکل نئی ہے، حال ہی میں خریدی ہے پورے چھ لاکھ میں ...... زخمی کے سر سے خون بہہ رہا ہے، میں اپنی کار کی سیٹوں کو اُس کے سر سے بہتے ہوئے خون سے رنگنا نہیں چاہتا ....!!''



رشتے

اور جب حاجی امیر الدین انتقال کر گئے تو کالونی کے قریب قریب سارے لوگ، مرد و زن، اُن کے ہاں جمع ہو گئے۔ سب کی آنکھیں نم تھیں، سب کی مسکراہٹیں گم تھیں۔ مرحوم اپنی شرافت، سادگی اور فراخ دلی کے لئے ساری کالونی میں احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ اُن کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ بزرگوں سے بات کرتے وقت بزرگانہ لب ولہجہ اپناتے تھے، جوانوں اور نوجوانوں سے اس طرح پیش آتے جیسے وہ خود بھی جوان ہوں۔ بچوں کے ساتھ بچوں جیسی حرکتیں اور شرارتیں کر کے اُن کا دل لبھاتے تھے۔ خواتین کا احترام کرنا اُن کی فطرت میں شامل تھا۔ اِسی پس منظر میں نہایت خلوص و احترام کے ساتھ مذہبی رسومات ادا کی گئیں اور شام اُترنے سے پہلے اُنھیں اپنے آبائی قبرستان میں دفنایا گیا۔ دوسری صبح جب بہت سارے ہمسایہ، رشتہ دار اور دوست واحباب اُن کے ہاں تعزیت پُرسی کے لئے آئے تو اُن کے بیٹے اور بہو کو وہاں نہ دیکھ کر حیران و پریشان ہو گئے، اُن کی غیر موجودگی کو سب نے محسوس کیا لیکن اُنہوں نے چاہتے ہوئے بھی خاموشی اختیار کی۔ لوگ آتے رہے اور جاتے رہے اس بات سے بے خبر کہ حاجی مرحوم کا بیٹا اور بہو حاجی صاحب کی خواب گاہ میں اُن کا لاکر توڑ کر سونے چاندی کے زیورات اور نقدی سنبھالنے میں مصروف ہیں۔۔!!



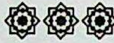
اُس کا دکھ

جب وہ ہمارے گھر آیا تب وہ دس سال کا بچہ تھا' بن ماں باپ کا' وہ دونوں کسی حادثہ کا شکار ہو چکے تھے۔ اُس کا ماموں اُسے ہمارے ہاں چھوڑ گیا۔ ہمارے گھر کے چھوٹے موٹے کام دیکھنے کے لئے لیکن ہم نے اُسے ایک بیٹے کی طرح پالا پوسا، پڑھایا لکھایا۔ وہ ہمارے ہاں دوسرے بچوں کے ساتھ اِس قدر گھل مل گیا کہ وہ اُن میں سے ہی ایک نظر آتا تھا۔ وقت گذرتا رہا' اُس نے مڈل کا امتحان پاس کیا اور پھر دو سال بعد میٹرک کا لیکن شہر میں رہتے رہتے موبائیل فون اُس کی کمزوری بن چکا تھا۔ سوتے جاگتے موبائیل فون اُس کے کان سے لگا رہتا۔ بار بار ٹوکنے کے باوجود جب اُس نے ہماری ایک بھی نہ سُنی تو ہم نے خاموشی میں ہی بہتری سمجھی۔ لیکن ایک دن.... صرف دس دن قبل اُس کے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ اُسے ایک فون آیا' نسوانی آواز میں' ایک مدھر سی آواز اُس کے کانوں میں گونجی اور بغیر سوچے سمجھے اُس کے ذہن و دل میں محفوظ ہو گئی۔

''میں گولڈن انٹرنیشنل کمپنی سے بول رہی ہوں۔ ہماری کمپنی ہر برس ملکی سطح پر اپنے پروڈکٹس کو فروغ دینے کے لئے مختلف لوگوں کا انتخاب کر کے اُنھیں انعامات سے نوازتی ہے۔ اس بار ہماری لسٹ میں آپ کا نام بھی شامل ہو گیا ہے اور آپ کو دس لاکھ روپے کے انعام سے نوازا جا رہا ہے۔ دس لاکھ کی لاٹری نکل آئی ہے آپ کے نام لیکن یہ رقم حاصل کرنے سے پہلے آپ کو ہماری کمپنی کا ممبر بننا پڑے گا۔ ہمارا بنک اکونٹ نمبر آپ کو SMS کے ذریعہ مل جائے گا۔ اس اکونٹ میں آپ دس ہزار روپے ٹرانسفر کر لیجیے اور ہماری کمپنی کا ممبر بن جائیے۔ چھوٹی سی رقم ہے یہ دس لاکھ کے مقابلے میں.... یہ رقم کمپنی کے

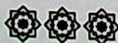
اکونٹ میں جمع ہوتے ہی آپ کے بنک اکونٹ میں دس لاکھ کا اضافہ ہوگا... کتنے خوش نصیب ہیں آپ....دس ہزار کے بدلے دس لاکھ....جلدی کیجئے ورنہ یہ سنہری موقع آپ کو پھر کبھی نہیں ملے گا....!''

اور اب گذشتہ دس دنوں سے وہ بے حد اداس نظر آتا ہے کھویا کھویا سا رہتا ہے۔ ہمارے لاکھ سمجھانے پر بھی کہ یہ ممکن نہیں ہے اور ایسے فراڈ آئے دن سامنے آتے رہتے ہیں وہ ہماری بات ماننے کو تیار نہیں...اُسے دُکھ ہے کہ اپنا سمجھنے اور عزیز رکھنے کے باوجود ہم نے اُسے دس ہزار کی رقم فراہم نہیں کی اور اِس طرح وہ دس لاکھ سے محروم ہوگیا.....!!



عینک

بابو جی جب کمرے سے باہر آنے لگے تو پہلا قدم رکھتے ہی اُنہیں احساس ہوا کہ آنکھوں پر عینک نہیں ہے۔ گرتے گرتے بچ گئے۔ بیٹا چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اُس نے اُٹھ کر سامنے پڑی عینک بابو جی کو دے دی۔ بابو جی نے عینک آنکھوں پر چڑھائی اور کچھ کہے بغیر کمرے سے باہر آ گئے۔ بیٹا دوبارہ چائے کی چسکیاں لینے لگا اور پھر اچانک ایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھر گئی۔ ایک خیال تیزی سے اُس کے ذہن میں گردش کرنے لگا۔ چند روز بعد باتھ روم سے باہر آتے ہوئے بابو جی اچانک فرش پر گر گئے۔ سر پر بہت زیادہ چوٹ لگنے کی وجہ سے کافی خون بہا اور کوما میں چلے گئے۔ کچھ دن کوما میں رہنے کے بعد ہمیشہ کے لیے اپنی بے نور آنکھیں بند کر لیں۔ بیٹا گھر آنے والے لوگوں کو بار بار کہہ رہا تھا۔ بابو جی کی آنکھوں کی روشنی بہت کمزور تھی۔ عینک کے بغیر کچھ بھی نہیں دیکھ پاتے تھے۔ اب کی بار جانے اپنی عینک کہاں چھوڑ آئے تھے۔!



لمحوں کی زنجیر

یوں تو وہ خوب صورت تھی، سندر تھی اور جوان بھی لیکن اُس کی مقبولیت اور شہرت کا راز اُس کی آواز میں پوشیدہ تھا۔اُس کی آواز اُس کے گائے ہوئے نغموں کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ وہ جب گاتی تھی تو محفل میں خاموشی طاری ہو جاتی، اُس کے دل کی گہرائیوں سے اُبھر کر جب کسی بھی گیت کے بول اُس کے نرم و نازک لبوں پر مسکرانے لگتے تو سننے والے ایک لذت بھری دنیا میں گم ہو جاتے، ایک سرور کی دنیا میں کھو جاتے، اُس کی آواز میں پاکیزگی تھی، اُس کی اپنی زندگی بڑی پر سکون تھی، سادگی اور شرافت سے لبریز تھی۔ کوئی بھی بُری عادت نہ تھی اُس میں............نہ تو سگریٹ پیتی تھی اور نہ ہی شراب............ پان یا زردہ سے ذرا بھر بھی دلچسپی نہ تھی، چائے تک بھی نہ پیتی تھی تاکہ اُس کا گلہ اَن دیکھی کڑواہٹوں سے پاک وصاف رہے۔اُس کی زندگی خوبیوں سے مالا مال تھی۔اس کی انمول صفت اُس کی آواز تھی اور اپنی آواز کو زیادہ سے زیادہ پُر درد اور پُر سوز بنانا اُس کی زندگی کی پہلی اور آخری تمنا تھی۔

آج صبح اخباروں میں اُس کی موت کی خبر سن کر لوگ حیران و پریشان ہو گئے۔ اُس کی آواز کے شیدائیوں کے لیے یہ خبر ناقابل یقین تھی۔ یہ ایک گلوکارہ کی نہیں، ایک آواز کی موت تھی............ڈاکٹروں نے بتایا کہ وہ گلے کے کینسر میں مبتلا تھی............!



نئی قیامت

آکاش اور دھرتی، عرش اور فرش یا یوں کہیے آسمان اور زمین دونوں ایک دوسرے سے بہت دور ہو کر بھی کس قدر قریب ہیں، ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے ہیں، ایک دوسرے کے ظاہر و باطن میں جھانکتے رہتے ہیں، ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں، جب کبھی دھرتی غم آلودہ ہو جاتی ہے تو آسمان بارش کی صورت میں بے تحاشا آنسو بہاتا ہے اور کبھی آکاش پر غم کے بادل منڈلانے لگتے ہیں تو زمین سونا اُگلنا بند کر دیتی ہے اور بنجر بن جاتی ہے اور کبھی دریاؤں کا رُخ پھیر کر ہر شئے سیلاب میں بہا دیتی ہے شاید آکاش اور دھرتی یا یوں کہیے آسمان اور زمین ایک دوسرے سے محبت بھی کرتے ہیں، خاموش، بے نام اور بے صدا محبت کبھی عاشق اور معشوقہ کا روپ اپنا کر اور کبھی محبوب اور محبوبہ بن کر اپنی انجانی اور اَن دیکھی محبت کو ابدیت بخشتے ہیں۔ ان دونوں کی بے لوث اور بے غرض اپنائیت میں اپنا ایک حسن ہے، خلوص ہے اپنے انداز کی منفرد خوبصورتی اور سندرتا ہے، اِن کی محبت پر بدلتے موسم کا کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ ہر بدلتے موسم کے رنگ اِن کو اور قریب لاتے ہیں، فضاؤں کو معطر بناتے ہیں، آکاش کی بلندیوں سے جب سورج کی چمکیلی کرنیں اپنی تمازت کا احساس دلاتی ہیں تو ساری دھرتی ایک نورانی چادر میں سمٹ کر رہ جاتی ہے تب یہ بات یقین کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ آکاش اور دھرتی ایک دوسرے سے ہرگز ہرگز دور نہیں، ایک دوسرے کے قریب ہیں اور ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہیں، آدھے اُدھورے ہیں!

کہتے ہیں کہ جب آسمان اور زمین کی آپسی بے تھکان محبت کائنات کی آخری

سرحد کو چھولے گی تو وہ دونوں عشق پیچاں کی بیل کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ لپٹ جائیں گے اور پھر ہر سمت قیامت کا سماں بپا ہوگا اور جب یہ قیامت بپا ہوگی تو اللہ جانے میں کہاں ہوں گا' آپ کہاں ہوں گے' ہم سب کہاں ہوں گے کیونکہ ہم ایک دوسرے سے قریب ہو کر بھی بہت دور ہیں' ہماری نزدکیاں دوریوں میں روپوش ہو چکی ہیں' ہمارے رشتوں میں خلوص نہیں' ہماری اپنائیت کے درمیان خود غرضی کی دیوار کھڑی ہو چکی ہے' کتنی عجیب بات ہے کہ آسمان اور دھرتی کی طرح ہمارے باطن اور ہماری روح میں کوئی رشتہ نہیں بلکہ ہم سب کے درمیان ایک خلاء پیدا ہو گیا ہے' ہم ایک دوسرے کے دکھ سکھ سے بے خبر ہو چکے ہیں' ہمارے جذبات اور احساسات کی ندی سوکھ چکی ہے!

ابھی تک تو میں حیات ہوں' آپ بھی ہیں اور ابھی تو قیامت بھی نہیں آئی ہے اس لئے آپ کی طرح دیکھ سکتا ہوں' بول سکتا ہوں' سوچ سکتا ہوں لیکن اس بات سے بخوبی واقف ہوں کہ میں آسمان کی جانب دیکھ نہیں سکتا۔ سورج کی تمازت میرے لئے قابل برداشت نہیں۔ یہ تمازت تو مجھے جلا کر راکھ کر دے گی اور پھر یہ راکھ ہمیشہ کیلئے دھرتی کی آغوش میں سمٹ کر رہ جائے گی کسی انجانے گوشے میں پوشیدہ ہو جائے گی یا فضاؤں میں تحلیل ہو جائے گی۔ حالات و واقعات کے ساتھ وقتی طور پر سمجھوتہ تو کیا جا سکتا ہے لیکن اپنے آپ اور اپنی سوچوں سے سمجھوتہ کرنا ناممکن تو نہیں مشکل ضرور ہے اور ناممکن کو ممکن میں تبدیل کرنے کے لئے دشوار گذار راہوں سے گذرنا پڑتا ہے اگر یہ بات میرے لئے آسان ہوتی' میرا ماحول میرا ہوتا' میرے آس پاس کے لوگ میرے ہوتے' میرے سکھ اُن کے ہوتے اور اُن کے دکھ میرے ہوتے' ہم سب کے خواب مشترک ہوتے تو میں...... میں ناممکن کو ممکن بناتے ہوئے اپنی وادی کے دور دراز علاقوں اور پہاڑوں میں گھوم گھوم کر اُن بے نام قبروں کی تلاش کرتا جہاں میرے جیسے، آپ جیسے، ہم جیسے اَن گنت اور لاتعداد معصوم' بے قصور اور بے داغ افراد بے نامی کا لباس اوڑھے ابدی نیند سو رہے ہیں۔ میں جس دھرتی پر رہ رہا ہوں' جس آسمان تلے سانسیں لے رہا ہوں وہاں اُن کو تلاش کرنا اُن کو اپنی پہچان دینا مشکل ہے اور ناممکن بھی لیکن مجھے یقین ہے' اپنی سوچوں پر اعتبار

ہے کہ جب آسمان اور دھرتی کا کسی اَن دیکھے لمحے میں ملاپ ہوگا اور دونوں عشق پیچان کی بیل کی طرح ایک دوسرے سے لپٹ جائیں گے تب جو سماں پیدا ہوگا وہ نہایت ہی قیامت خیز ہوگا کیونکہ دھرتی آسمان کا بوجھ برداشت نہ کر پائے گی اور پوری دھرتی میں جگہ جگہ شگاف پیدا ہوں گے اور پھر بے نام قبروں میں سوئے ہوئے بے نام مکینوں کو باہر آنے سے کوئی بھی روک نہ سکے گا اور وہ ایک سیلاب کی صورت میں ایک علامت بن کر حق و صداقت کی صلیب کاندھوں پر لٹکائے ہوئے جگہ جگہ، جنگل جنگل، بستی بستی، فرش سے عرش تک بکھر جائیں گے۔ ایک نئی آواز اُبھرے گی، ایک نئے انسان کا جنم ہوگا، ایک نئے سفر کی شروعات ہوگی اور اس سفر کو طے کرتے ہوئے ایک نئی زندگی کے آثار پنپنے لگیں گے۔!

اور ایک بار پھر آسمان اور زمین یا یوں کہیے دھرتی اور آکاش قیامت خیز حالات و واقعات کے دامن کو تار تار کرتے ہوئے محبت کے بندھنوں میں بندھ جائیں گے اور بہت دور ہو کر بھی بہت نزدیک نظر آنے لگیں گے، ایک دوسرے کے ظاہر و باطن میں جھانکنے لگیں گے، مل جل کر خوابوں میں رنگ بکھیرنے لگیں گے!

کیا آپ اور میں یہ سب کچھ دیکھ سکیں گے کیا یہ سب کچھ ہماری نظروں کے سامنے ہوگا؟ اس کا جواب میرے پاس نہیں ہے اور شاید آپ کے پاس بھی نہیں ہے، اُن کے پاس بھی نہیں ہے جو بے نام قبروں میں بے نامی کا لباس اُوڑھے سو رہے ہیں......موت کی دائمی اور ابدی حقیقت سے آشنا ہونے کے باوجود زندگی کی دلکشی اور رعنائی سے کون پیار نہیں کرتا لیکن یہ پیار پانے کے لئے ہم سب کو اِنتظار رہے گا ایک نئی قیامت کا......؟!



کیا یہ بھی کوئی افسانہ ہے؟

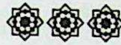
میں ایک شہر ہوں اور مجھے اس بات کا بھرپور احساس ہے کہ میں اپنے وشال ملک کا ایک چھوٹا سا شہر ہوں، ایک عام سا شہر جیسے ہر شہر ہوتا ہے۔ لیکن دوسرے شہروں کے مقابلے میں میری اپنی ایک تاریخ ہے، ایک عظیم تاریخ اور میری تاریخ کے ہر باب میں بہت ساری تصویریں پوشیدہ ہیں، رنگ رنگ کی تصویریں۔ ہر تصویر ایک کہانی ہے، انسانی زندگی کی کہانی، زندگی کے مختلف پہلوؤں کی کہانی۔ چھوٹا شہر ہونے کے باوجود تہذیب و تمدن، علم وادب، مذہبی شعور اور انسان دوستی کی انمول مثالوں کے ساتھ ساتھ نفیس، لطیف، وجدانی اور تخلیقی علامتیں میرے نام کو روشن کیے ہوئے ہیں۔ میرے یہاں شریف النفس انسان رہتے ہیں، ان کی شرافت کی وجہ سے سب میری عزت، میرا احترام کرتے ہیں۔ دوسرے شہروں کی طرح میں بھی بدلتے موسموں کا شہر ہوں لیکن میرے یہاں بھانت بھانت کے مذاہب، دھرموں اور عقائد کو ماننے والے لوگ امن وآشتی کے ساتھ رہتے ہیں۔ سب ایک ہیں۔ ایک جیسے ہیں۔ میرے ان مکینوں میں سادگی کے ساتھ پاکیزگی بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی رومانیت اور حُسن کاری آس پاس کے رہنے والوں کو بے حد متاثر کرتی ہے۔ میرے یہاں فن ہے اور فنکار بھی، کھیت ہیں اور ان کھیتوں سے اناج اُگانے والے کسان بھی، گلستان میں گلوں کو سجانے والے باغبان بھی ہیں...... ہاں میں ایک شہر ہوں!

لیکن...... لیکن کسے معلوم تھا کہ اب کی بار جو موسم آئے گا وہ میرے یہاں پرندوں کی اُڑانوں اور شام کی دستک سے پہلے گزر کر اندھیروں میں کھو جائے گا، کالا سیاہ

لبادہ اوڑھ کر آلودگی اور کثافت کا آسیب بن کر ایک نئی تاریخ رقم کرے گا، ایک اَن دیکھی، انجانی تاریخ...... کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ سارا آسمان خالی خالی نظر آتا ہے لیکن دل بھرا بھرا سا لگتا ہے اور آنکھوں سے بے تحاشہ آنسو ٹپکنے لگتے ہیں اور کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ دل خالی خالی سا لگتا ہے اور آسمان بھرا بھرا سا اور پھر بارش کا روپ اپنا کر آنسو دھرتی کو قطرہ قطرہ سیراب کرتے ہیں، بارش اور آنسوؤں کی یہ حالت زار دیکھ کر دل کی دھڑکنیں رُک رُک سی جاتی ہیں۔ دل کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن دل ہے کہ سنبھلتا نہیں۔ میں ایک شہر ہوں اور آج میرے یہاں ایک عجیب سا، انجانا سا واقعہ پیش آیا...... کیسے کہوں، کیسے سناؤں اپنے شہر کی بات؟ ہوس کی راکھ نے میرے وجود کو کثافت کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا ہے۔ میرے ہنستے مسکراتے خواب گمنام راہوں میں کھو چکے ہیں۔ جی ہاں کل رات میری تاریخ کے اوراق میں ایک اور باب کا اضافہ ہو گیا۔ ایک بدصورت، بدنام اور بدرنگ باب...... میرے دیکھتے دیکھتے ٹھیک میرے سامنے، میرے وجود کو چھلنی کر کے دو کلیوں کو پھول کا روپ اپنانے سے پہلے ہی مسل دیا گیا، اُن کی خوشبو اور اُن کے آنے والے کل کی خوشیاں چھین لی گئیں۔ دونوں کا تعلق ایک مفلس اور پسماندہ گھرانے سے تھا، شاید اسی لیے جب اُن کی آبروریزی کی داستان اُن کے گھر کی نیم پختہ دیواروں میں سمٹتے سمٹتے، بکھرتے بکھرتے کھڑکی سے آنے والی کسمساتی ہوئی صبح کے جھلملاتے اُجالوں سے ٹکرا گئی تو مایوسیوں کا زہر ہر جانب پھیل گیا اور اب زہر پھیلتے پھیلتے میری تاریخ کا ایک حصہ بنتا جا رہا ہے۔

میں ایک شہر ہوں اور اب شدت سے یہ احساس ہو رہا ہے کہ میں واقعی چھوٹا ہوں، بہت چھوٹا۔ اپنی سوچ میں، اپنے کردار میں، اپنے من کے آئینے میں دیکھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ اب نہ تو مجھ میں سادگی ہے اور نہ پاکیزگی۔ میں تو اب سیاہ خوفناک مکوڑوں کے جال میں اُلجھ چکا ہوں اور اس اُلجھے ہوئے ماحول میں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا ہے سوائے دو معصوم نو عمر لڑکیاں، دو اَن کھلی کلیاں، آبروریزی کے بعد آگ کی نذر کر کے جن کی پہچان کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ اُن کی عزت و آبرو کو مسمار کرنے والے یہ درندے کون ہیں؟

میرے شہر سے تعلق رکھتے ہیں یا کسی اور شہر سے، میں نہیں جانتا۔ یہ حالت دیکھ کر تو گونگا ہو چکا ہوں، بول نہیں سکتا۔ اندھا ہو چکا ہوں، دیکھ نہیں سکتا۔ بہرہ ہو چکا ہوں، سُن نہیں سکتا۔ لیکن میں تو اپنے آپ کو جانتا ہوں اپنے نام سے واقف ہوں۔ میں جو ایک شہر ہوں، کبھی میں تاریخ کا ایک سنہرا باب تھا لیکن اب اپنا نام لیتے ہوئے شرم سی محسوس ہوتی ہے...........ہاں میں شہر بدایوں ہوں...........!!



دستانے

میرا پوتا اخبار پڑھنے میں اِس قدر مصروف نظر آ رہا تھا کہ سامنے پڑی چائے نہ جانے کب کی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ کوئی خاص خبر تھی اُس کی نظروں کے سامنے۔ مجھے لگا جیسے وہ خبر بھی پڑھ رہا ہے اور اِس تعلق سے کچھ سوچ بھی رہا ہے۔ اچانک اُس نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔

''دادو''

''ہاں بیٹے''

''آپ کے دستانے تھے نا جو آپ سردیوں میں استعمال کرتے ہیں۔''

''ہاں بیٹا وہ تیری دادی نے کسی صندوقچے میں سنبھال کر رکھ دیئے ہوں گے لیکن اِس وقت، گرمی کے اِس موسم میں میرے دستانے تمہیں کیسے یاد آ گئے۔''

''دادو اخبار میں خبر شائع ہوئی ہے۔''

''کیسی خبر... ذرا میں بھی تو سنوں''

''وہ محمد علی ہوا کرتے تھے نا محمد علی باکسر''

''ہاں بیٹا وہ اپنے زمانے کے نامور باکسر تھے، بہت بڑا نام تھا اُن کا... پر وہ اب حیات نہیں لیکن اُن کا نام آج بھی کھیل کے تماشائیوں کے ذہنوں میں محفوظ ہے۔''

''دادو اُن کے دستانے''

''دستانے.... کیا کہنا چاہتے ہو۔ بیٹا''

''اُن کے دستانے دادو چار لاکھ روپیے میں نیلام ہوئے۔ ہاں چار لاکھ روپیے میں بِک گئے۔''

''ضرور بِک گئے ہوں گے۔''

''دادو جب اُن کے دستانے چار لاکھ روپیے میں بِک سکتے ہیں تو آپ کے کیوں نہیں۔''

چہرے

قریب قریب پینتیس برسوں سے یونیورسٹی بنک میں ملازمت کرتا آرہا ہوں اور اب دو ماہ بعد سٹھ برس کی عمر میں اس ملازمت سے سبکدوش ہو رہا ہوں، بنک ملازمت کے دوران میں نے اپنی زندگی کے بہت سارے اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔ لیکن مجھے اس بات کا بھرپور احساس ہے کہ محنت، لگن اور ایمانداری کو کسی بھی شعبے میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ شاید اسی وجہ سے مجھے ہمیشہ ہی اپنے بنک کا کیش سیکشن سنبھالنا پڑتا ہے۔ بنک میں آنے جانے والے قریب قریب ستر فیصد افراد کا کام کیش سیکشن سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ اس پس منظر میں میں نے ان گنت لوگ دیکھے ہوں گے۔ بے شمار انجانے اور جانے پہنچانے چہرے میری نظروں کی راہ سے گذرے ہوں گے۔ یہ سلسلہ اب بھی قائم و دائم ہے۔ لوگ آرہے ہیں جا رہے ہیں لیکن ان سب کے خدوخال اپنے ذہن میں محفوظ رکھنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ کیش سیکشن میں میرا کام بظاہر آسان نظر آتا ہے۔ ٹوکن لینا، ٹوکن نمبر رقم اور نام رجسٹر پر درج کرنا اور پھر چیک پر بنک کی مہر لگا کر رقم چیک والے کے ہاتھوں میں تھما دینا لیکن کام مشکل بھی ہے۔ ذراسی لاپرواہی یا غلطی سے مالی نقصان کا اندیشہ بھی لاحق ہوسکتا ہے لیکن اللہ کا شکر ہے کہ مجھے کبھی بھی کسی بھی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور نہ ہی کوئی مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ لیکن آج مجھے اسی بنک میں بنک اور مجھ سے لاتعلق ایک ان دیکھے کرب سے گذرنا پڑا۔ شدید ذہنی پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اس بوڑھی خاتون کو دیکھ کر میرے ذہن میں جانے کیسے کیسے خیالات اُبھرنے لگے۔ وہ اکیلی نہ تھی۔ اکیلی ہوتی تو شاید میرے ذہن میں کوئی بھی سوال نہیں اُبھرتا۔ اس کے ساتھ ایک نوعمر لڑکا بھی تھا۔ خوش

رنگ، خوش شکل، چہرے پر معصومیت کے آثار صاف صاف نظر آرہے تھے۔ بوڑھی خاتون نے ٹوکن میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''مہربانی کر کے صاف نوٹ دیجئے گا''۔

''جی ضرور! آپ فکر نہ کریں''۔ اور میں نے نوٹوں کا ایک نیا بنڈل کھول کر اس کی رقم دینے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ خاتون کے ہاتھ آگے بڑھنے سے پہلے ہی اس نوعمر لڑکے کا ہاتھ میری جانب بڑھا۔

''مجھے دیجئے''

''بیٹا تمہیں کیسے دے سکتا ہوں یہ رقم اِن کی ہے۔

''یہ میری دادی ہے''

''ضرور ہوگی لیکن فیملی پنشن کی یہ رقم ان کی ہے اور ان کو ہی ملنی چاہئے''۔ یہ سننے کے بعد اس نے اپنا بازو ہٹا لیا۔ میں نے کونٹر کے اور قریب آکر رقم خاتون کے ہاتھوں میں تھما دی اور وہ دونوں چلے گئے!

اُن کے جانے کے ساتھ ہی ایک خیال ایک سوچ نے نہ جانے کیسے میرے ذہن میں انگڑائی لی۔ درد و کرب کی کون سی لکیر اُبھر آئی۔ میں نے لاکر بند کیا اور کیبن سے باہر آیا۔ وہ دونوں بنک کے گوشے بھی کھڑے محوِ گفتگو تھے۔ نوعمر لڑکا رقم کیلئے ضد کر رہا تھا۔

''ممی نے کہا تھا کہ ساسو ماں سے پنشن کی پوری رقم لے کر میرے حوالے کر دینا''۔ یہ آواز میرے کانوں سے ٹکرائی اور مجھے لگا کہ جیسے کسی نے گرم سلاخیں میرے کانوں میں ٹھونس دی ہوں۔ ایک عجب سی جلن کا احساس ہوا۔ اور اس جلن نے مجھے جلا جلا کر راکھ کر دیا۔

''ہر ماہ یہی ہوتا ہے اور مجھے دوائی خریدنے کے لئے اس کی منتیں کرنا پڑتی ہیں۔ دیکھو بیٹا تمہارے دادا کے مرنے کے بعد جو پنشن مجھے ملتی ہے یہ میرے بڑھاپے کا سہارا ہے۔ اس تھوڑی سی پنشن سے میں اپنی دیکھ بال کر سکتی ہوں۔ اس ماہ یہ رقم میرے پاس ہی رہنے دو اگلے ماہ کی پنشن بہو کو دوں گی۔''

اور اس کے بعد میں کچھ بھی نہ سن سکا۔ شاید مجھ میں سننے کی قوت نہ تھی۔ شاید میرے کان بہرے ہو چکے تھے۔ انہیں دیکھتے ہوئے بھی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ شاید میری آنکھیں روشنی سے محروم ہو چکی تھیں۔ میں کیش سیکشن کی جانب بڑھا۔ بنک کا لاکر کھولنے سے قبل میرے ذہن میں ایک اور خیال نے انگڑائی لی۔ دو ماہ بعد بنک کی ملازمت سے سبکدوش ہو رہا ہوں اور پھر موت کا کیا بھروسہ؟ میں اگر مر گیا تو ....؟! تو میری بیوی ...... میری بیوہ ...... میری پنشن؟! اور اب بوڑھی خاتون اور نوعمر لڑکے سمیت سارے چہرے میری نظروں سے اُوجھل ہو چکے تھے صرف دو ہی چہرے نظر آ رہے تھے ...... میری بیوی اور میری بہو کا ...... اور مجھے لگا جیسے میری بیوی آنسو بھری آنکھوں سے کہہ رہی ہو۔

''بہو پنشن کی یہ رقم میری دوائی کیلئے ہے۔ میری دیکھ بھال اور گذر بسر کیلئے ہے۔ اسے مت چھینو...... رہنے دو میرے پاس ...... یوں مجھے تڑپ تڑپ کر سِسک سِسک کر رونے نہ دو''

بھائی صاحب کس سوچ میں ہیں آپ'' ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''میں ...... میں ...... نہیں ...... کچھ بھی نہیں ...... وہ پنشن ...... فیملی پنشن''

''پنشن ...... فیملی پنشن ...... کس کی ...... آپ کچھ پریشاں سے لگ رہے ہیں''۔

''نہیں تو''

''تو پھر یہ ٹوکن لیجئے''

میں نے اپنی پلکوں کو جنبش دی اور اپنی نظر میں اٹھا کر دیکھا۔ کونٹر کے سامنے نئے پرانے چہروں کی ایک لمبی قطار میری منتظر تھی ......!!!



کشمیری کہانیاں

...اردو روپ

۱۔ ہری کرشن کول

۲۔ صوفی غلام محمد

۳۔ محمد امین کامل

۴۔ اختر محی الدین

۵۔ محی الدین ریشی

فہیم اور منشا کے لئے

کشمیری کہانی

تحریر: ہری کرشن کول

اردو روپ: نور شاہ

ایک صاحب دوسرے صاحب

چائے آگئی اور ایک صاحب نے چائے بناتے بناتے دوسرے صاحب سے کہا۔ ''آپ فرقہ پرست ہیں، فرسودہ خیالات کے مالک ہیں تعجب ہے کہ آپ قوم کو فروخت کرنا چاہتے ہیں اور لوگوں کو نیکی کی راہ سے ہٹانا چاہتے ہیں تا کہ ملک ترقی اور خوشحالی کی منزل کو چھو نہ سکے۔ میں مانتا ہوں اور مجھے اس بات کا احساس ہے کہ سیدھے سادے لوگ آپ کی باتوں کی مٹھاس میں کھو جاتے ہوں گے مگر...... انشاء اللہ ہم سب عوام کے سامنے آپ کی اصلیت کو بے نقاب کر کے ہی رہیں گے!

''کتنی چینی،

''ایک چمچ''

''آپ نے کب سے کھانڈ کم لینا شروع کر دی''

''کوئی ایک سال سے'' دوسرے صاحب نے کہا۔

''ڈاکٹر نے کہا ہے کہ چینی کم لیا کرو، روٹی صرف ایک وقت کھاتا ہوں اور ہفتے میں ایک دن کچھ بھی نہیں لیتا۔''

''کچھ افاقہ ہوا''

جی ہاں بہت! آپ دیکھ نہیں رہے ہیں کہ پہلے سے میرا موٹاپن کس قدر کم ہوا ہے''۔

''ہاں ایسا لگ رہا ہے''

دونوں نے خاموشی سے چائے پی، ایک صاحب نے چائے پینے کے بعد سگریٹ سلگایا اور دوسرے صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''آپ ظالم ہیں، ڈکٹیٹر ہیں، ہٹلر صرف ایک نام تھا، آپ کے خلاف جو بھی آواز اٹھاتا ہے آپ اسے قید کروا لیتے ہیں، ان کو قسم قسم کے مظالم کا سامنا کرنا پڑتا ہے، باقی رہی قوم کی ترقی، خوشحالی اور بہبودی، عوام کی معاشی حالت بد سے بدتر ہوگئی ہے، آپ اور آپ کے ساتھی مل جل کر غریبوں کا خون چوستے ہیں، یہ شان و شوکت اور اقتدار سکندر بھی رکھ نہ سکا۔ آپ کس گنتی میں ہیں۔ اچھا تو یہ بتایئے۔ بے بی کو پینٹ کرنے کا شوق اب بھی ہے''۔

''جانے کیا بناتی رہتی ہے، لکیریں کھینچ کھینچ کر، کہتی ہے یہ ماڈرن آرٹ ہے، خدا گواہ میری سمجھ سے باہر ہے''

''ماڈرن آرٹ کہیے یا جدیدیت اب تو یہ بھی ادب میں شامل ہوگیا ہے، نہ نظم سمجھ میں آتی ہے اور نہ افسانہ''

''یہ اس کا کرم ہے کہ سیاست میں جدیدیت شامل نہیں ہوئی ہے، ورنہ ایک دوسرے کا نکتۂ نظر جاننا اور سمجھنا اور بھی مشکل ہو جاتا''

دونوں ہنس پڑے اسی دوران کمرے میں ایک آدمی داخل ہوا اور پہلے صاحب کے کان میں کچھ بڑبڑانے لگا۔

''دیکھئے اندر سے فرمان آیا ہے کہ آپ لنچ کر کے ہی جائیں گے''

''نہیں میں لنچ نہیں لے سکوں گا میری طرف سے معذرت کر لیجئے''۔

دوسرے صاحب نے کہا۔

''معذرت کس لئے، کھانا کھانے کے لئے ہمیں آپس میں کوئی ذاتی دشمنی تو نہیں، یہ تو اصولوں کی لڑائی ہے'' پہلے صاحب نے کہا۔

''آپ درست فرما رہے ہیں، اصولوں کی لڑائی ہے، میں اصولوں کے لئے جان بھی گنوا سکتا ہوں، لوگ جانتے ہیں اور اسی لئے مجھ پر جان نچھاور کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں، میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ ان کی فرعونیت ختم کر کے ہی دم لوں گا تا کہ میری عوام کو زندگی

کی ہر آسائش فراہم ہو، باقی آپ کے اور میرے تعلقات یہ تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قائم ودائم رہیں گے"

"منا نے امتحان دیا تھا"

"جی ہاں"

"پرچے کیسے ہوئے"

"کہتا تھا کہ اچھے ہی ہوئے ہیں، جلد ہی پتہ چل جائے گا"۔

"مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے اس نے"

"ابھی کچھ نہیں، دیکھ لیتے ہیں"

"آپ کہہ دیں تو ولایت پڑھنے کے لئے بھجوادیں گے یا کوئی اچھی خاصی نوکری کا انتظام کرلیں گے۔ہم دونوں کے آپس میں اختلاف ضرور ہیں لیکن ان بچوں کا کوئی دوش نہیں۔منا میرا اپنا بیٹا جیسا ہے"۔

"جی ہاں ہم دونوں ایک جیسے ہی تو ہیں، ایک دوسرے کے لئے ہرگز ہرگز غیر نہیں"

"اچھا رزلٹ نکلنے کے بعد میرے پاس بھجوادیں میں خود ہی بات کرلوں گا"

"بہتر"

پہلے صاحب نے اپنی پائپ سنبھال لی اور ایک کش لینے کے بعد کہا۔

"پرسوں آپ کا ایڈیٹوریل پڑھا، اچھا ہی لکھا تھا"

"میں نے آپ کی انتہا پسند عنصر کی نکتہ چینی کی تھی"

"آپ کو اظہارِ خیال کی پوری آزادی ہے"

کچھ دیر دونوں صاحبان خاموش بیٹھے رہے، ایک صاحب پائپ پیتے رہے اور دوسرے صاحب تصویروں کی کتاب دیکھنے لگے پھر پہلے صاحب نے دوسرے صاحب سے کہا۔

"پھر آپ نے لنچ کے بارے میں کیا سوچا"

''بھابی کی دعوت ہے، انکار کرنا مشکل ہو رہا ہے ہاں اگر آپ نے کہا ہوتا تو انکار کرتا''

اس دوران چار آدمی کمرے میں داخل ہو گئے پہلے صاحب سے ہاتھ ملایا اور کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

''کل سارے علاقے کا دورہ کرنا ہے آپ کو''

پہلے صاحب نے ان کی طرف گھورتے ہوئے دیکھا اور پھر کہا۔ ''آپ تجربہ کار اور باشعور کارکن ہیں آپ کو کچھ بھی کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی''

''جناب استقبال بہت ہی شاندار ہوگا'' ان چار آدمیوں میں سے ایک نے کہا۔

''یہ استقبال میرے لئے نہیں ہوگا بلکہ اس کاز، ان اصولوں کے لئے ہونا چاہیے جو ہمیں پیارے ہیں، میں تو ان اصولوں کی ایک علامت ہوں'' پھر اس صاحب نے واسکٹ کی جیب سے نوٹوں کا ایک بنڈل نکالا اور ان کے حوالے کر دیا۔

ان چار آدمیوں میں سے ایک آدمی بول پڑا۔ ''استقبال بھرپور ہوگا، تازہ پھولوں کی مالائیں رنگ برنگے کاغذی پھولوں کی بھرمار، شاندار پلیٹ فارم، جناب ایسا شاندار اور جاندار استقبال ہوگا کہ ہمارے دشمنوں کے حوصلے ہمیشہ کے لئے پست ہو جائیں گے''۔

پہلے صاحب نے بھرپور قہقہہ لگایا ان چار آدمیوں نے دوسرے صاحب کی طرف کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ سب اس کا خون چوسنا چاہتے ہوں مگر وہ کتاب کے اوراق پلٹنے میں مصروف تھا، اس نے شاید ان کی باتیں سنی ہی نہیں تھیں یا وہ جان بوجھ کر انجان بن رہا تھا، جب وہ چاروں آدمی گئے تو اس نے پہلے صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا تو آپ کل دورے پر جا رہے ہیں اور یہ تیاریاں اسی سلسلے کے لئے ہو رہی ہیں''

''تیاری کرنے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے''

''جی نہیں ہم نے بھی تیاری کی ہے''

''اچھا آپ کا کیا پروگرام ہے''

''آپ کا سیاہ جھنڈیوں سے استقبال ہوگا''

''جھنڈیاں وغیرہ تیار کرلی ہیں نا''

''پرسوں ہی کپڑا دے آیا تھا۔ آپ کے کارکن اچھا کام کرتے ہیں کیا''

''کیوں نہیں آخر وہ لوگ ایک بڑے کاز کے لئے لڑ رہے ہیں، سرگرم عمل ہیں''

''وہ تو نظر آ ہی رہا ہے''

''کیا نظر آ رہا ہے آپ کو'' پہلے صاحب نے زور دے کر کہا، میں ان چیزوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں عوام میرے ساتھ ہیں''

''عوام ہمارے ساتھ بھی ہیں'' دوسرے صاحب نے بھی زوردار لہجے میں کہا۔

''اور ہاں ذرا پانچ ہزار روپے مجھے بھی دے دیجئے''

''کیوں کیا ضرورت پڑی''

''بازار سے جو کپڑا لیا تھا اس کی قیمت چکانی ہے اور کچھ پیسے بھی بانٹنے ہیں''

باہر سے کچھ آواز سی سنائی دی، دونوں پریشاں ہوگئے، پائپ والے نے کسی کو آواز دی اور پھر اسے باہر جانے کے لئے کہا کہ وہاں کیا ماجرا ہے۔

اور وہ شخص حالات کا جائزہ لینے کے بعد آیا۔

''جناب یہاں سے آپ کے حامیوں کا جلوس جا رہا تھا'' اس نے پائپ والے صاحب کے سامنے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ نعرے لگا رہے تھے، آپ کا زندہ باد کر رہے تھے وہ چوک کے قریب پہنچے تو دوسری طرف سے ایک اور جلوس آ رہا تھا ان کا جلوس تھا'' اب وہ دوسرے صاحب کی جانب اشارہ کر رہا تھا۔

''پھر کیا ہوا'' ایک صاحب نے پوچھا۔

''جناب پھر کیا ہونا تھا۔ چوک ہی میں دونوں کا آمنا سامنا ہوا، میرا مطلب ہے دونوں جلوس ایک دوسرے کے سامنے آ گئے۔ دونوں طرف زوردار نعرے بلند ہوئے، پھر

ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ پتھراؤ ہوا کہتے ہیں بائیس آدمی زخمی ہو گئے جن میں سے آٹھ کی حالت نازک ہے''۔

دونوں صاحب نہایت افسردہ ہوئے، ایک دوسرے کی طرف دیکھ نہ سکے اور نہ ہی کچھ بول سکے۔

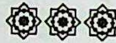
''یہ بہت بُرا ہوا'' آخر ایک صاحب بول پڑے۔

''تشدد کی راہ غلط ہے، اس کی مذمت کی جانے چاہیے، سیاسی لڑائی تو اصولوں کی لڑائی ہوتی ہے۔'' دوسرے صاحب بولے۔ ''تشدد سے اس کی افادیت کم ہو جاتی ہے دوسرے صاحب نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''دراصل ہمارے لوگوں میں شعور کی کمی ہے'' پہلے صاحب نے آہ بھرتے ہوئے کہا اور پائپ کو ایک بار پھر سلگانے لگا۔

دوسرے صاحب نے کچھ بھی نہ کہا، اس نے اپنا سگریٹ مسل دیا۔

اب دونوں لنچ کا انتظار کر رہے تھے۔!!!



کشمیری کہانی

تحریر: صوفی غلام محمد

اردو روپ: نور شاہ

دیواریں

دھرم سنگھ کی زندگی یوں تو ایسے ان گنت واقعات سے بھر پور تھی لیکن آج کا جو واقعہ اس کی نظروں کے سامنے اتھل پتھل مچا رہا تھا وہ اس کے لئے کافی چونکا دینے والا تھا، اس نے سن رکھا تھا خواب کبھی حقیقت کا روپ نہیں اپناتے مگر آج اس نے دیکھا کہ خوابوں نے سچ مچ ہی حقیقت کا پیرہن اوڑھ لیا تھا، پورے بیس سال بعد آج پھر ایک بار دھرم سنگھ اپنے گاؤں لوٹ آیا تھا، وہ گاؤں جہاں اس نے اپنی ماں کی کوکھ سے جنم لیا تھا، جہاں اس کا بچپن، اس کا لڑکپن بیتا تھا، جہاں اس کی جوانی نے ایک نیا رنگ وروپ اپنا لیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ فسادات، یہ لوٹ مار اور جنگ کیسے عام آدمیوں کو گھر سے بے گھر بنا دیتی ہے، یہ جنگ ہمیشہ اپنے ساتھ بربادی اور پشیمانی لاتی ہے مگر دھرم سنگھ سوچ رہا تھا اگر یہ جنگ نہ ہوئی ہوتی تو اس کے خوابوں کی تعبیر اس کے سامنے نہ ہوتی، اس نے بس ایک لمحے میں عمر کی بیس منزلیں طے کی تھیں، وہ پھر اسی گاؤں میں لوٹ آیا تھا جہاں کے درختوں کی ٹھنڈی اور میٹھی چھاؤں میں اس کا بچپن بیتا تھا جہاں کی ندیوں کی شیریں گہرائیوں میں مچھلیوں کی طرح اپنے ہاتھ پاؤں پھیلائے ڈبکیاں لگائی تھیں، جہاں اس نے سورج ڈوبتے سمے ہیر رانجھا کے مدھر رسیلے بول گنگنائے تھے اور جہاں اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ کبڈی کھیلی تھی یہ جنگ اس کے خوابوں کی زندہ جاوید تصویر تھی، صرف ایک دن پہلے اسے پتہ چلا کہ کل سویرے وہ دشمن پر حملہ کرنے جا رہے ہیں مگر اسے کیا معلوم تھا کہ یہ وہی جگہ ہوگی، اپنا گاؤں اپنی دھرتی، اپنی مٹی افسر لوگ آخری لمحہ تک نہیں بتاتے کہ حملہ کب، کیوں اور کس

جانب ہوگا۔فوجیوں کی جنگ کا احساس بس اسی لمحے ہوتا ہے جب ان کی بندوقیں آگ اگلنا شروع کر دیتی ہیں، ہواؤں میں زہر گھل مل جاتا ہے انسانوں کا دم گھٹنے لگتا ہے، سانسیں رکتی ہیں اور لاشوں کے انبار لگ جاتے ہیں لیکن دھرم سنگھ کی زندگی آج پہلی بار اس واقعہ سے دو چار ہوئی تھی جب اسے اپنے افسر نے آگے بڑھنے کا حکم دیا اور حکم سن کر اسے ان راہوں کی خوشبو کا احساس ہوا تھا جن راہوں نے بیس سال پہلے آخری بار اس کے قدموں کے نشانوں کو اپنے وجود میں گم کر دیا تھا، دھرم سنگھ کو یاد آیا ستمبر کے یہی دن تھے خزاں کی پر اسرار زردیاں چھانے لگی تھیں، کھیتوں میں فصلیں لہلہا رہی تھیں جب وہ اپنے گھر سے بے گھر ہو کر اپنی جان بچانے کی خاطر چٹانوں اور پھیلے ہوئے درختوں کی آغوش میں پناہ لینے پر مجبور ہوا تھا، اس دن ایک قیامت بپا ہوئی تھی، ماں کو اس کے بیٹے کا علم نہ تھا، بھائی بھائی سے بچھڑ گیا تھا، جن کھیتوں میں دل لبھانے والے گیت گائے جاتے تھے ان کھیتوں میں معصوم بچوں کی چیخیں اور زخمی عورتوں کی آہیں ابھرا ابھر کر دھرتی کے سینے کو چیر رہی تھیں، جہاں دھرم سنگھ، رحیم خاں، کرشن تلک اور محمود کبڈی کھیلا کرتے تھے وہاں انسانوں کے کٹے ہوئے سر بکھرے پڑے تھے، دھرم سنگھ جب اپنے گھر سے باہر نکلا تو اس کی بیوی پہلے ہی گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی، دھرم سنگھ کو آج تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس پر کیا بیتی وہ زندہ ہے یا مر چکی ہے، یہ بھی ممکن تھا کہ وہ آج بھی زندہ ہو، دھرم سنگھ سوچ رہا تھا اور اپنے آپ سے باتیں کرتے جا رہا تھا، بچپن اور جوانی کے واقعات جن پر نہ جانے کتنے سالوں کی گرد جم چکی تھی۔آج ایک ایک کر کے اسے یاد آ رہے تھے، اس کی نظروں کے سامنے چمک رہے تھے، آنکھ مچولی کھیل رہے تھے، یہ ٹھیک ہے کہ جنگ کے دوران توپوں کی گن گرج میں ایک فوجی کے لئے ایسا سوچنا بڑا ہی کٹھن ہے لیکن جب ایک خواب اچانک حقیقت کا روپ اپنا لیتا ہے تب میدانِ جنگ میں بھی ایک فوجی خندق ایک سپاہی کے لئے اس کے گھر کا کمرہ بن جاتی ہے، خصوصاً جب یہ خندق اس رات کی آغوش سے لپٹی ہوئی ہو جس کے ساتھ اس کے بچپن اور پیار کا سمندر رہا ہو، دھرم سنگھ نے اپنی زندگی میں کئی جنگیں دیکھی تھیں اور کئی لڑائیاں لڑی تھیں دھرم سنگھ کو وہ لمحہ بھی یاد آیا جب اس کے گاؤں کا ساتھی رحیم خان دشمن کی

گولی لگنے سے منہ کے بل زمین پر گرا تھا دشمن بھاری تعداد میں آگے بڑھ رہا تھا، گولیوں اور توپوں کی آگ چاروں سمت پھیلی ہوئی تھی، دشمن کی طوفانی پیش قدمی دیکھ کر فوجی افسروں نے اپنے سپاہیوں کو پیچھے ہٹ جانے کا حکم دیا، جب دھرم سنگھ حکم کی تعمیل میں اپنی خندق سے باہر نکلنے لگا تھا تو رحیم خاں نے یاس بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا وہ زخمی ہو چکا تھا اور خون رس رس کر اس کے سارے جسم کو رنگ رہا تھا وہ جینے کی خاطر موت سے لڑ رہا تھا مگر اس کے جینے کی آس تبھی پوری ہو سکتی تھی جب اس کو کوئی سہارا دیتا، دھرم سنگھ اس قدر بے رحم نہ تھا کہ اپنے بچپن کے ساتھی کو یوں اکیلا چھوڑ دیتا دان گنت خطرات سے بے نیاز ہو کر دھرم سنگھ نے زخمی رحیم خاں کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر خندقوں اور پر خطر گھاٹیوں کو عبور کر کے ایک محفوظ مقام پر پہنچا کر ہی دم لیا۔ دھرم سنگھ نے رحیم خاں کو ایک نئی زندگی بخش دی، دھرم سندھ کو وہ واقعہ بھی یاد آیا جب رحیم خاں نے اپنی زندگی کا یہ قرضہ اسے چکا دیا تھا یہ وہی دن تھے جب دھرم سنگھ اپنی زندگی بچانے کی کوشش کر رہا تھا کئی دن اسے کھانے کے لئے بھی کچھ نہ ملا تھا، جس آزادی کی خاطر اس کی اور اس کے دوستوں کی آرزوئیں جنم پا رہی تھیں، وہ آزادی اپنے ساتھ بربادی اور پشیمانی لائی تھی، انسانی خون ارزاں ہو گیا تھا آباد بستیاں ویران ہو گئی تھیں، ہزاروں سالوں کی پرانی انسانی روایت بے موت مر گئی تھی۔ جن گھروں میں زندگیاں ناچ رہی تھیں وہاں اب موت کے کالے بادل چھائے ہوئے تھے زندگی تڑپ رہی تھی موت اپنے پر پھیلا چکی تھی، دھرم سنگھ اور اس جیسے بہت سے انسان زخمی فاختاؤں کی طرح اپنی زندگیوں کی آخری سانسیں ویرانوں میں گن رہے تھے مگر دھرم سنگھ کی زندگی میں ایک معجزہ رونما ہوا تھا رات کے بھیانک اندھیرے میں رحیم خاں نے سہارا بن کر دھرم سنگھ کو بے وقت اور بے رحم موت سے بچا لیا تھا۔ دھرم سنگھ کو وہاں سے نکالنے میں رحیم خاں نے ایک اہم رول ادا کیا تھا۔ یہ گزرے ہوئے واقعات ایک ایک کر کے دھرم سنگھ کو یاد آرہے تھے یوں تو وہ خندق میں بیٹھا ہوا تھا مگر اس کی تصور کی نگاہیں جوانی کی وادیوں میں گھوم پھر رہی تھیں۔

اتنا طویل عرصہ...... وقت کا یہ احساس دھرم سنگھ کو اس وقت ہوا جب اس نے

اپنے چھوٹے سے بیگ سے آئینہ نکال کر اپنی صورت دیکھی اس کے بہت سے بال سفید ہو چکے تھے آج اتنی طویل مدت کے بعد حالات نے ایک عجیب سا رخ اپنا لیا تھا وہ ایک بار پھر اپنے ہی گاؤں میں زندگی اور موت کے درمیان کھڑا تھا۔انسان پیدا ہوتا ہے پروان چڑھتا ہے جوان ہوتا ہے اور پھر بڑھاپا اسے گھیر لیتا ہے اور ایک دن مر جاتا ہے لیکن یادیں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔پھلتی بھولتی ہیں اتنے سال بیتنے کے بعد بھی آج اس نے اپنے گاؤں کو اسی حالت میں پایا تھا جیسے وہ چھوڑ کر چلا گیا تھا وہ لہلہاتی کھیتیاں تھیں سرسبز گھاٹیاں تھیں، وہی پگڈنڈیاں تھیں، وہی راہیں تھیں، پہاڑی کے دامن میں وہی شور مچاتی ندی تھی۔جہاں گاؤں کی گوریاں مدھر گیت الاپتی تھیں۔دھرم سنگھ سوچ رہا تھا کہ آخر ایسا کیوں کر ہوا کہ وہ اور اس جیسے لاکھوں لوگ بے گھر ہو گئے اگر یہ لہلہاتے کھیت اپنی صورتیں نہیں بدلتے تو پھر کیا وجہ ہے انسان کے خیالات بدل جاتے ہیں، اگر زمین کا رنگ ایک ہی ہے، ندی نالوں میں بہتے ہوئے پانی کی لے ایک جیسی ہے درختوں اور پیڑوں کی چھاؤں میں ٹھنڈک ایک جیسی ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ رحیم خان سرحد کے پار اپنی زندگی گزار رہا ہے اور دھرم سنگھ سرحد کے اس پار کیوں اور کس لئے؟ دھرم سنگھ کو محسوس ہوا جیسے اپنے گاؤں میں نہیں بلکہ اپنی ماں کی گود میں دبکا پڑا ہے!

دفعتاً ایک دھماکہ ہوا گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی آگ پھیلتی گئی، افسر نے آگے بڑھنے کا حکم دیا دھرم سنگھ کے بہت سارے ساتھی مر چکے تھے، ہر طرف شور بپا تھا، ہر سمت دھواں بکھرا ہوا تھا، دھرم سنگھ کا سپاہی جاگ پڑا وہ بھی آگے بڑھا اور ایک خندق میں گھس گیا وہاں پہلے ہی ایک سپاہی موجود تھا، دونوں ایک دوسرے پر سبقت لینے کی کوشش کرنے لگے، دونوں ایک دوسرے پر بندوق چلانے کی تگ ودو میں لگ گئے، ایک گولی چلی...... پھر دوسری گولی چلی...... پھر بندوقیں خاموش ہو گئیں...... دونوں سپاہی ایک دوسرے کو دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔دونوں زخمی تھے۔خون بہہ رہا ہے اور پھر ایک آواز آئی...... دھرم سنگھ تم...... دوسری جانب سے بھی ایک آواز ابھری...... رحیم خاں تم...... شاید اب دونوں کے درمیان کوئی دیوار حائل نہ تھی!!۔

کشمیری کہانی

تحریر: امین کامل

اردو روپ: نور شاہ

نیا تحفہ

چوکیدار نے گیٹ کھول دیا تھا اور آن کی آن میں کولتار کی بل کھاتی سڑک ناگن بن گئی...... رنگ و بُو کی ایک لہر اُبھری اور ساری سڑک پر بکھر گئی، دن میں دوبارہ یہ سڑک اسی طرح اپنے مخصوص انداز میں اپنی صورت بدلتی ہے، دس بجے صبح جب کالج کا گیٹ کسی الھڑ دوشیزہ کی خواب آور آنکھوں کی طرح نیم وا ہو جاتی ہے اور چار بجے بعد دوپہر جب یہ گل لالہ کی طرح بند ہوتا ہے...... اور اگر سنیچر کا دن ہو...... آج کی طرح...... تو چار بجے کی بجائے ڈیڑھ بجے ہی یہ سڑک ناگن کا روپ اپنا لیتی ہے......!

ابھی ابھی جب یہ گیٹ کھلا اور رنگ برنگے سرسراتے ہوئے بھڑک دار لباس اور دھیمی دھیمی سی سرگوشیوں کی نرم نرم سی مہک اور جلترنگ بجاتے قہقہوں کی موسیقی کا ایک تیز دھارا آیا اور سوچ سمجھ کی حدوں کو پھاندتا ہوا سرکنے لگا...... شیلاؔ اور زبیدہ جب گیٹ سے باہر آئیں تو اس جلترنگ میں ایک عجیب سا سرور رچ بس گیا۔ شکل و صورت ایک جیسی، چال ڈھال ایک، ملتا جلتا لباس، لگتا تھا جیسے دونوں ایک ہی ماں کی بیٹیاں ہوں، اتنے تھوڑے عرصے میں اِن کی دوستی مثال بن گئی تھی اس دوستی کی بنیاد شیلا نے ہی ڈالی تھی......!

زبیدہ کا ایک ہی نام ہو سکتا تھا...... اَچھ وُار...... کہنے سے نہیں بلکہ وہ حقیقی روپ میں ایسی ہی تھی، اگر مسلمان ہونے کی وجہ سے وہ عربی برقعہ استعمال نہ کرتی تو خدا جانے اب تک کتنے پاگل پن کی حد کو چھو چکے ہوتے، شیلا بھی کچھ کم خوبصورت نہ تھی اُس کی مست مست آنکھوں میں نہ جانے کتنی خواب آور انگڑائیاں اتھل پتھل مچا رہی تھیں......!

گھر کی جانب چلتے چلتے جب وہ سنیما کے قریب آگئیں تو اُن کے قدم بے ساختہ رک گئے۔ فلم ''آوارہ'' لگی تھی۔ میٹنی شو تیار تھا۔ اس فلم کی پبلسٹی کچھ اس ڈھنگ سے کی گئی تھی کہ ہر زبان پر اسی کا ذکر تھا، سنیما کے سامنے بھی لوگوں کا بے اندازہ ہجوم تھا۔

''چلو ہم بھی دیکھیں'' شیلا نے کہا'' کہتے ہیں اب تک ایسی فلم نہیں بنی ہے۔''

''کیا کہتی ہو؟ زبیدہ نے برقعہ کی اوٹ سے جواب دیا'' ٹکٹ کہاں ملے گا، دیکھ نہیں رہی ہو کتنی بھیڑ ہے۔''

''وہ تو میری ذمّے داری ہے، ہم تو بغیر ٹکٹ کے جائیں گے، تو ذرا ٹھہر'' شیلا نے کہا۔

''لیکن کیسے؟ کیا یہاں تمہارا کوئی رشتے دار کام کرتا ہے؟

''رشتے دار ہی تو ہے، تم ٹھہرو، میں یوں گئی اور واپس آئی۔''

زبیدہ سوچنے لگی...... آج تو ہاف ڈے ہے، فلم دیکھنے کے لئے معقول بہانہ ہے اور پھر گھر بھی وقت پر پہنچ جائیں گے...... زبیدہ انہی سوچوں میں گم تھی کہ شیلا لوٹ آئی۔ اُس کے ہاتھ میں دو فری پاس تھے، ہونٹوں پر دبی دبی سی مسکان لئے وہ ہال میں داخل ہو گئیں۔

فلم کا شو چار بجے ختم ہوا۔ وہ دونوں باہر آئیں اُن کے کانوں میں اب بھی فلم کے مدھر مدھر گیت گونج رہے تھے۔ آنکھوں میں راج کپور کی بے پناہ اداکاری بسی ہوئی تھی، دونوں کے چہرے گلابی رنگت میں ڈوبے ہوئے تھے شیلا کے چہرے کی رنگت سبھی دیکھ رہے تھے۔ زبیدہ کی رنگت کو برقعے نے چھپالیا تھا۔ ''شیلا نے کہا۔'' چل نہرو پارک تک ہو آئیں۔''

تم آزاد ہو مگر میں گھر والوں کو کیا جواب دوں گی؟''

''تم تو ایسا کہہ رہی ہو جیسے تمہارے گھر والے ہر قدم پر تمہارے ساتھ ہیں۔''

''لیکن وہ جانتے ہیں کہ آج کالج جلدی بند ہو جاتا ہے...... میں کیا جواب دوں گی؟''

"بس وہی جواب جو تم ڈیڑھ بجے سے چار بجے تک فلم دیکھنے کے لئے دوگی، اور پھر وقت ہی کتنا لگے گا، زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ......!!"

زبیدہ کو بھی گھر جانے کا موڑ نہ تھا شاید یہ فلم کا اثر تھا۔ ویسے بھی وہ چاہ رہی تھی کہ یہ برقعہ سرِ راہ پھینک دے، ہر چلنے والے کی نظریں شیلا کے رنگ وروپ پر ٹھٹھک کر رہ جاتی تھیں۔ زبیدہ بھی جوان تھی، خوبصورت تھی، وہ اپنی جوانی اور خوبصورتی کا بھرپور مظاہرہ کرنا چاہتی تھی، پر یہ برقعہ اس کے احساس اور اُس کی سندرتا کے درمیان ایک پردہ تھا......ایک دیوار......!!

سنیما کے سامنے بہت سے تانگے تھے جو سواریاں بھر بھر کر مختلف سمتوں کو جا رہے تھے کچھ اب بھی سواریوں کے منتظر تھے، شیلا نے ایک تانگہ بان کو ہاتھ سے اشارہ کیا، یہ تانگہ ایک الگ تھلک جگہ کھڑا ہوا تھا جیسے وہ بھی اُنہی کا منتظر ہو، تانگہ بالکل نیا تھا، رنگ وروغن سے سجی سنوا تھا اور گھوڑا بھی صحت مند تھا اور پہلی ہی نظر میں تیز رفتار دکھائی دے رہا تھا۔

نہرو پارک ڈل جھیل کے کنارے آباد مغل باغات کے بعد ایک نئی جگہ ہے جہاں پانچ بجے شام سے رات دس گیارہ بجے تک زندگی اپنے بھرپور شباب پر ہوتی ہے مگر ابھی پانچ بجنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا، وہاں چند ہی لوگ نظر آرہے تھے، شیلا اور زبیدہ ٹانگے پر سوار فلم سے متعلق باتیں کر رہی تھیں، یوں تو دونوں کے سوچنے سمجھنے کا انداز ایک ہی جیسا تھا مگر اس وقت وہ الگ الگ انداز اور زاویئے سے باتیں کر رہی تھیں اور ظاہر ہو رہا تھا کہ ان کو ایک دوسرے سے کئی باتوں پر اختلاف بھی ہے۔

نہرو پارک ابھی کچھ ہی دور تھا، ڈل جھیل کے کنارے بہت سے سیاح گھوم پھر رہے تھے۔ جواں دلوں کی دھڑکنیں ایک دوسرے کو محسوس کرنے، سمجھنے اور جاننے کی کوشش کر رہی تھیں اوپر شنکر چاریہ کی پہاڑیوں پر بادلوں کے دبیز سائے لمحہ بہ لمحہ بکھرتے جا رہے تھے، اچانک جانے تانگہ بان کو کیا سوجھا اُس نے گھوڑے کو چابک مارا، گھوڑا بدک گیا اور بے تحاشہ دوڑنے لگا، شیلا گھبرا گئی اور اُس سے زیادہ، زبیدہ......اُن کے پسینے چھوٹ گئے۔

دونوں نے زور سے ایک دوسرے کو تھاما۔

زبیدہ چلا اٹھی۔ ’’بچاؤ‘‘۔

شیلا نے کہا۔ ’’موت تو ایک حقیقت ہے مگر مرنے سے پہلے یہ رسوائی‘‘۔ تانگہ بان نے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ ’’آپ فکر نہ کیجئے، دراصل غلطی میری ہی تھی‘‘۔

اوبرائے پیلس ہوٹل کے قریب تانگہ بان گھوڑے کو روکنے میں کامیاب ہو سکا...... دور سے ایک کار اُن کے قریب آکر اس تیزی سے رکی جیسے اوبرائے ہوٹل کے بار میں بے ساختہ گلاس ٹکرا گئے ہوں۔ ڈرائیور کار سے اترا اور تانگہ بان کے قریب آکر اُسے گالیاں دینے لگا...... ’’جب تم جانتے ہو کہ تمہارا گھوڑا چابک مارنے سے بے قابو ہو جاتا ہے تو تم نے ایسی حرکت کیوں کی......؟ تانگہ بان خاموش رہا۔

’’آیئے میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں......‘‘ ڈرائیور نے کہا اور اس کے ساتھ ہی اُس نے کار کا دروازہ کھول دیا۔

زبیدہ موٹر میں بیٹھنے سے کچھ گھبرا رہی تھی، لیکن شیلا نے اُس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا...... ’’وہ دونوں کار میں بیٹھ گئیں، ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کی، نہرو پارک کی جانب موڑنے کی بجائے وہ بڑی تیز رفتاری کے ساتھ کار کو مغل باغات کی جانب لے چلا۔ زبیدہ بے تحاشہ گھبرا گئی، مگر شیلا میں نہ تو خوف کی کوئی جھلک نظر آئی اور نہ ہی کوئی حیرانی...... اُس نے بُرقعے کا نقاب اُلٹ دیا اور کہا......‘‘ یہ سب تم نے کیا......؟ شیلا کی نگاہیں جھک گئیں اور چہرے کا رنگ اڑ گیا......!!

کار ایک گلی میں رک گئی، ڈرائیور نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا...... آپ فکر نہ کریں میں آپ کو گھر بھی پہنچا دونگا۔‘‘

انسان جب بے بس ہو جاتا ہے تو اپنے دشمن سے بھی ہمدردی کی توقع رکھتا ہے، زبیدہ نے بڑی بے بسی کے انداز میں شیلا کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور گلی سے کوٹھی میں آ گئی......! وہ ڈرائینگ روم میں صوفہ پر بیٹھ گئیں، ڈرائیور دوسرے کمرے میں چلا گیا......!

''یہ تم نے کس کے لئے کیا، اور کیوں کیا، میں نے تمہیں پہچاننے میں دیر کی......''!

زبیدہ بولتے بولتے رک گئی جیسے وہ کئی دنوں سے بیمار ہو اور بے حد کمزور......!!

زبیدہ مجھے معاف کرنا، میں یہ سب کچھ کرنے پر مجبور ہوئی......خود میرے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا ہے......مجھ سے میرے خواب چھین لئے گئے، لڑکپن کے کنوارے خواب......میری تمناؤں کا گلا گھونٹ دیا گیا مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا گیا، میرا ماضی، میرا مستقبل، اب مجھے کوئی نیا تحفہ پیش کرنے کے لئے مجبور کیا گیا......وہ تحفہ تم ہو......!'' شیلا کی آنکھیں بے ساختہ آنسوؤں میں ڈوب گئیں۔

باہر قدموں کی چاپ اُبھری، ڈرائیور ہاتھ میں مٹھائی کی پلیٹ لئے اندر آیا اُس نے شیلا کو ایک مبہم سا اشارہ کیا اور پھر باہر چلا گیا۔ شیلا نے زبیدہ کو اندر کے کمرے میں جانے کے لئے اشارہ کیا۔ زبیدہ کا دل دھڑک اُٹھا، اُس نے شیلا کو ایک بار پھر نفرت آمیز نظروں سے دیکھا......اور......کمرے کے اندر چلی گئی۔

ایک سناٹا سا چھا گیا......!

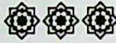
اور کچھ دیر بعد گندمی رنگ کا ایک شخص جو چہرے سے کوئی حاکم اور رویئے سے نواب لگتا تھا ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ اُس نے اندر قدم رکھتے ہی شیلا کو شیطانی نظروں سے دیکھا اور پھر ایک بھرپور قہقہہ لگایا......شیلا یہ انداز دیکھ کر حیران نہ ہوئی جس قدر وہ زبیدہ کو اطمینان سے دوسرے کمرے کے دروازے پر اپنے کالے بُرقعے کے بٹنوں کو ٹِچ ٹِچ بند کرتے ہوئے دیکھ کر حیران ہوگئی۔ وہ اب شیلا کو چلنے کے لئے اشارہ کر رہی تھی......!

دونوں موٹر میں بیٹھ گئیں اور گھر کی جانب چل پڑیں راستے میں دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ کوئی بات نہ کی، شاید دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ بات کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن جب موٹر سے اُتر کر اپنے اپنے گھر کی طرف جانے لگیں تو شیلا ہمت کر کے ندامت بھرے لہجے میں زبیدہ سے کہنے لگی......'' مجھے معاف کرنا......تم اب تک جان چکی ہو گی کہ......مجھے کیوں اور کس کے لئے کرنا پڑا......میں بہت بے بس اور

مجبور تھی......''!!

''تمہاری مجبوری کا مجھے احساس ہے۔'' زبیدہ سے سنجیدہ لہجے میں کہا...... یہ دوسری بات ہے کہ میں اُس کے لئے کوئی نیا تحفہ نہ تھی، میں بہت پہلے اُس کے جال میں پھنس چکی ہوں''۔

گلی میں داخل ہوتے ہوئے زبیدہ نے آسمان کی طرف دیکھا سیاہ آسمان پر ایک کالے رنگ کا بادل سکڑتا جا رہا تھا اور کچھ ہی لمحے میں وہ ایک دھبے میں بدل گیا۔ زبیدہ کو ایسے محسوس ہوا جیسے وہ چھوٹا سا بادل اُس کے سینے میں سے اُترا۔ اُسے سامنے والی گلی...... اُس کی اپنی گلی اندھیاروں میں ڈوبی ہوئی نظر آنے لگی......!!



کشمیری کہانی

تحریر: اختر محی الدین

اردو روپ: نور شاہ

ایک چھوٹی سی قیامت

''مر گیا چوزہ'' اُس نے کہا۔

''مر گیا تو کیا ہوا'' میں نے من ہی من میں سوچا۔

''چوزہ مر گیا'' اُس نے ایک بار پھر زور دے کر کہا۔

میں نے اپنی آنکھوں کو جنبش دی اور اس کی جانب دیکھا، اچھا خاصا انسان تھا۔ صحت مند، دُھلے دُھلے سے کپڑوں میں ملبوس، دیوانگی کی کوئی علامت نظر نہیں آ رہی تھی، البتہ بال بکھرے ہوئے تھے، آنکھیں سرخ اور حلقوں سے باہر نکلی ہوئی تھیں، دائیں ہاتھ میں کالے رنگ کا ایک مَرا ہوا چوزہ لے کر کبھی میری اور کبھی مَرے ہوئے چوزے کی جانب دیکھ رہا تھا، یہ سب کچھ مجھے عجیب سا لگ رہا تھا، میں کہہ بھی سکتا تھا کہ چوزے تو مرتے ہی رہتے ہیں، کسی کو چیل اٹھا کر لے جاتی ہے، کوئی کتے کا شکار ہو جاتا ہے، کوئی اچانک مر جاتا ہے اور کوئی کسی آسودہ گھر کی مالکن کے پیروں تلے آ کر مر جاتا ہے، بس ایسے ہی مرتے ہیں، یہ بھی ایسے ہی مر گیا ہوگا تو پھر؟

لیکن میں کچھ بھی نہ کہہ سکا!

اُس کے ہاتھوں میں جو چوزہ تھا اُس میں کوئی خاص بات تو تھی نہیں کہ اُس کی موت کسی اچھے خاصے انسان کو دیوانہ بنا دیتی، کالا رنگ، چھوٹے پَر اور موٹی لمبی ٹانگیں، کمر کی جلد کھردری اور سفید، مجھے تو گھن آ رہی تھی لیکن کچھ اس کا دل رکھنے کے لئے اور کچھ اُس چوزے کی خصوصیات جاننے کے لئے میں نے آخر پوچھ ہی لیا۔

''یہ کسی بڑی نسل کا چوزہ ہوگا کیوں؟''

''لعنت ہو نسل پر'' اُس نے تیز لہجے میں کہا ''نسل کچھ بھی رہی ہو اس کا اور پھر شاید اس کا کسی بھی نسل سے کوئی تعلق نہ رہا ہو۔ پھر میں سوچ بھی نہیں سکتا''......وہ اپنی بات مکمل نہ کر سکا......!

''نام تو صرف اُسی کا رہنے والا ہے'' میں نے اُسے تسلی دینا چاہی۔

''کس کا'' اُس نے کچھ ایسے ہی لہجے میں جواب دیا۔

میں بے بس سا ہو گیا اور ایک بار پھر اُس چوزے کا جائزہ لینا شروع کیا تاکہ موت کے بعد بھی اُس کی اہمیت کا کچھ اندازہ لگا سکوں، کوشش کے باوجود بھی مجھے اُس چوزے میں کوئی بھی خصوصیت نظر نہیں آئی۔ کالے رنگ اور نحیف جسم کی وجہ سے یہ چوزہ اور بھی بدصورت لگ رہا تھا۔

''یہ اس کی کمر کو کیا ہوا ہے'' میں نے بات کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اُس نے کچھ اس طرح چوزے کی کمر کو دیکھا جیسے پہلے اس کی طرف اُس کی توجہ ہی نہیں گئی تھی، اُس کے بعد بائیں ہاتھ سے اُس کے پَر ایک طرف ہٹا کر دیکھنے لگا، میری نظروں میں بھی تجسس تھا، چوزے کی کمر پر جیسے سفید آٹا چھڑکا ہوا تھا جو خشک خشک نظر آ رہا تھا۔

''یہی روگ اس کی جان لے بیٹھا'' اُس کے لہجے میں اُداسی تھی''۔اصل میں کوئی کسی کا نہیں، ماں باپ بھائی بہن، جھوٹے ہیں یہ سب رشتے''۔

خدا جانے یہ فلسفیانہ انداز کیوں؟

''یہ پاوڈر ویٹرنری والوں نے چھڑکا تھا'' اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ اسے پھینک کیوں نہیں دیتے''۔ میں نے کہا۔ ''ایسے ہی ساتھ ساتھ لئے پھرنے سے کیا ہوگا''۔

''اب وہی کروں گا'' اُس کے لہجے میں لاچارگی تھی جیسے کسی عزیز کو دفن کرنے جا

رہا ہو۔

''یہاں اس نالی میں پھینک دو، کوئی کتا یا کوّا آ کر لے جائے گا''

میں نے کہا۔

''کیا کہہ رہے ہو تم'' اُس نے ناراض ہو کر کہا، میری بات سے وہ دکھی ہو گیا تھا۔

''آخر ہو نا اسی دنیا کے رہنے والے۔ میرا خیال تھا کہ تم عقل مند ہو، بات سمجھ جاؤ گے'' اُس نے مایوسی کے انداز میں کہا۔

میں خاموش ہو گیا!

''کس قدر معصوم ہوتا ہے''۔

''کیا'' میں نے جاننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''ایک نوزائیدہ بچہ، گائے کا بچھڑا، چوزہ یہ سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ایک جیسا مزاج رکھتے ہیں، اس ساری کائنات کو وہ اپنا گھر سمجھتے ہیں، ان کے پھلنے پھولنے اور پلنے کے لئے ہی یہ ساری کائنات وجود میں آئی ہے''۔

میں سن رہا تھا، وہ شاید اپنی بات کی وضاحت کرنا چاہتا تھا۔

''اپنی مثال لو، اگر اچانک تمہارے چہرے کے سامنے ہاتھ لہرا دوں تو گھبرا کر پیچھے ہٹ جاؤ گے، اس لئے کہ خوف کا جذبہ تم پر پروان چڑھ چکا ہے اور اب تم اس جذبے کو مار نہیں سکتے اس کے برعکس اگر کسی دودھ پیتے بچے کی گردن پر چھری رکھ دو گے تو اُسے کوئی پروا نہ ہو گی، وہ اسے کھلونا سمجھ کر نظرانداز کر دے گا۔ شاید مسکرا بھی دے کچھ لمحے۔ سنو پھول کو اگر اپنے انجام کی جانکاری ہو تو وہ وقت سے پہلے ہی مُرجھا جائے گا''۔

میں سن بھی رہا تھا، سوچ بھی رہا تھا اور ہنس بھی رہا تھا، میری نظروں کے سامنے سے ایک کارواں سا گذرنے لگا، ہنستے کھیلتے پھولوں کا، کسی فلسفی کی طرح سوچ میں ڈوبی کلیوں کا، شوخ شہابی رنگ کے رخساروں کی طرح کھلنے والے گلابوں کا سدا بہار اور بنفشی پھولوں کا...... ''سب اُس کی قدرت ہے'' میرے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

''کس کی'' الفاظ کی صورت میں یہ ایک طمانچہ تھا۔

''ڈر گئے'' وہ ہنسا ''تم تو کچھ بھی نہیں جانتے، خدا جانے چیل کہاں سے اپنے پر پھیلا کر یہ چوزہ اٹھالائی، اس کے نرم گرم سینے میں اپنے بے رحم پنجے گاڑ کر، شاید کہیں اطمینان سے بیٹھ کر اسے مار ڈالنے کا ارادہ رکھتی تھی ضرور مار ڈالتی لیکن اُس کی گرفت سے چوزہ آزاد ہوا اور سیدھے ہمارے آنگن میں آگرا''۔

''اچھا'' میں غور سے سننے لگا۔

''گرتے سمے میں نے اسے دیکھا اور کتے نے بھی، دونوں لپک پڑے میں تو نہیں پکڑ سکا کتا پکڑنے میں کامیاب ہوا، میں نے پتھر اٹھایا اور کتا میرے ہاتھ میں بڑا سا پتھر دیکھ کر ڈر گیا، چوزے کو وہیں چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اب میں اکیلا اُس کے پیچھے دوڑ پڑا، یہ اپنی پتلی پتلی لمبی لمبی ٹانگوں کے سہارے بھاگتا رہا، کسی کو بلا رہا تھا شاید اُسے جس نے گھاس کے ڈھیر پر اپنی آغوش کی گرمی سے اُسے زندگی دی تھی، لیکن کون آتا وہاں اور وہ بھاگ کر جاتا بھی کہاں...... میں نے پکڑ لیا، ہاں میں نے......'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

اور پھر کہنے لگا...... ''اگر اچانک تمہارے سامنے شیر سانپ، ریچھ یا پاگل کتے نمودار ہو جائیں اور تمہارے پیچھے دوڑنے لگیں، تمہیں مارنے کے لئے، کیا حالت ہوگی تمہاری، تم نہیں جانتے، کوئی بھی نہیں جانتا وہ بھی نہیں جس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہو، کیونکہ ایسے موقعوں پر ٹانگوں کے ساتھ ساتھ حواس بھی جواب دے جاتے ہیں، انسان بھاگتا ہے، لیکن کدھر، یہ نہیں جانتا، میں نے چوزہ پکڑ لیا، خوف سے وہ تھر تھرا رہا تھا، آنکھیں باہر نکل آئی تھیں، عجیب وغریب آوازیں نکال رہا تھا، شاید رو رہا تھا، یا شاید رحم کی بھیک مانگ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو، میں تو بس ایک چوزہ ہوں، میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا، مرغا ہوتا تو اذان دیتا، مرغی ہوتی تو انڈے دیتا، لیکن میں تو ایک چوزہ ہوں...... ہمارے گھر میں ایک مرغی خانہ ہے، اُس میں مرغ ہیں، مرغیاں ہیں، میں نے سوچا اپنی برادری میں رہے گا تو حفاظت سے رہے گا، بے خوف رہے گا، نہ تو انسان کا ڈر ہوگا اور نہ ہی چیل یا کتے کا...... میں نے چوزے کو اُسی مرغی خانے میں ڈال دیا، کوئی گھنٹہ بھر بعد جب میں اُس طرف نکلا تو جانتے ہو کیا دیکھا''، اُس نے آنکھیں گھما کر میری طرف دیکھا، لمحے بھر کے

لئے میں اُسے ایسے ہی تکتا رہا، بے حس، خاموش...... جانتے ہو میں نے کیا دیکھا۔

''نہیں تو'' بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

''مرغیوں نے چونچیں مار مار کر چوزے کی کمر کی کھال کا وہ حشر بنایا تھا کہ اُس کی کمر کی ہڈیاں صاف نظر آرہی تھیں اور خون ان پر جم گیا تھا...... وہ ایک کونے میں دبکا بیٹھا تھا۔ میں نے اُسے پکڑ لیا اب کی بار بھاگا نہیں، میری گرفت سے بچنے کے لئے مچلا نہیں، دھیمی دھیمی آوازیں نکال رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو، اب تو خوش ہو، اب میں مرنے جا رہا ہوں، میں تم سے کہہ رہا ہوں، تو جو انسان ہے، کتا ہے، چیل ہے، مرغا ہے، خوش ہو گئے، اب میں مرنے جا رہا ہوں، اذان نہیں دوں گا، انڈے نہیں دوں گا...... اب میں کسی کام کا نہیں رہا، ہاتھ میں پکڑتے ہی میں نے چاول کے چند دانے اُس کے سامنے رکھے، دو ایک بار چونچیں ماریں، شاید بھوکا تھا، یا شاید میرا دل رکھنے کے لئے ایسا کر رہا تھا...... ویٹرنری لے گیا، ویٹرنری والوں نے پاوڈر چھڑکا اس کے زخموں پر، اُسے گرم رکھنے کی کوشش کی، اب اُسے نہ میرا خوف تھا اور نہ ہی کسی اور کا صرف دھیمی دھیمی آوازیں نکال رہا تھا، میرے زخموں پر نمک چھڑک رہا تھا، میری روح سے باتیں کر رہا تھا۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد دم توڑ دیا......''

اب وہ رو رہا تھا اور اس مرے ہوئے چوزے کو دیکھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

''سنا تم نے آخر مر گیا''

وہ اس کے لئے چوزے کی موت نہ تھی، شاید ایک چھوٹی سی قیامت تھی!!!



کشمیری کہانی

تحریر: محی الدین ریشی

اردو روپ: نور شاہ

خواہش

''نہیں نہیں مجھے نہیں مرنا ہے۔ مجھے ابھی بہت سارے کام انجام دینے ہیں، پہلے تو اُن غریبوں اور ناداروں کی مدد کرنی ہے جن کی دعاؤں کے صدقے میں تحصیل دار بن گیا ہوں۔ ابھی تو میں نے اُن کے لئے کچھ کیا ہی نہیں...... پھر بھلا ابھی سے کیوں مروں......؟ مجھے تو آل انڈیا ایڈمنسٹریٹو سروس میں بھی جانا ہے......اور پھر میں نے جمیلہ سے بھی تو وعدہ کیا ہے کہ میں اس کے ساتھ شادی کروں گا...... میرے بوڑھے ماں باپ ہیں نا......، میرے بعد اُن کی دیکھ بھال کون کرے گا......!''

بظاہر تو یونس میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں مر چکا ہے لیکن ہمت نہیں ہاری ہے۔ وہ اپنے گھر کے بارے میں سوچ سوچ کر موت کے ساتھ زندگی کی لڑائی لڑ رہا ہے!!

وہ چار ماہ سے انٹنسیو کیئر یونٹ میں پڑا ہوا ہے۔ بے حس ہے...... ڈاکٹر کہتے ہیں کہ کوما میں چلا گیا ہے۔ علاقے کے سارے لوگ ہسپتال میں آتے رہتے ہیں اور اس کی صحت یابی کے لئے دعائیں مانگتے ہیں ان کا آنا تو اسی روز سے شروع ہوا تھا جب انہوں نے سنا کہ یونس کا سکوٹر ایک ملٹری گاڑی سے ٹکرا گیا ہے اور وہ بے حد زخمی ہو گئے ہیں۔

''میں تو اپنے علاقے کے لوگوں کی آنکھوں کا تارا ہوں اور علاقے کے لوگوں کی مجھ سے بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔!!''

ڈاکٹر صاحب یونس کو بچانے کی بھر پور کوشش کر رہے ہیں!

ڈاکٹر، یونس کو دیکھنے آچکا ہے۔ اس کا نبض دیکھتے ہوئے ڈاکٹر کو احساس ہو رہا

ہے جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ڈاکٹر نے کچھ سوچ کر قلم اس کے ہاتھ میں تھما دیا بڑی مشکل سے کچھ لکھنے کے بعد قلم یونس کی انگلیوں سے کھسک گیا ہے۔ڈاکٹر نے جب کاغذ کی لکیروں میں جھانکنے کی کوشش کی تو اُسے پڑھنے میں کوئی وقت نہ ہوئی۔اُس نے لکھا تھا۔

"I am an important Person please Save my life"



فلمی فیچر (علمی اور ادبی پس منظر میں)

۱۔شکیل بدایونی

۲۔کیفی اعظمی

ملکہ ترنم نور جہاں

......گیتوں بھری کہانیاں......ڈرامائی انداز میں

ویدراہی کی نذر

شکیل بدایوانی

آوازیں:

۱) ایک مردانہ آواز

(۲) ایک زنانہ آواز

..............ہلکی ہلکی موسیقی اُبھرتی ہے اور آہستہ سے پس منظر میں چلی جاتی ہے!

اور پھر فلم ''امر'' سے شکیل بدایونی کے تحریر کردہ گیت سے چند اشعار سنائی دیتے ہیں ۔

دکھ دے کے جو دُکھیا سے نہ انصاف کرے گا
بھگوان بھی اس کو نہ کبھی معاف کرے گا

(گیت کے بول فیڈ اوٹ ہوجاتے ہیں)

مردانہ آواز: شکیل کا تعلق بدایوں کے خستہ خاندان سے تھا، اور پورے بدایوں میں خستہ خاندان اپنے مذہبی شعور، فکر و لہجہ اور انسان دوستی کے جذبہ سے پہچانا جاتا تھا۔ اسی خاندان کے ایک فرد مولانا جمیل احمد قادری کے ہاں 3 / اگست 1916ء کی شام ایک بچے نے جنم لیا، غفار احمد تاریخی نام اور شکیل احمد اصل نام رکھا گیا۔

ہلکی، ہلکی موسیقی اُبھرتی ہے......!

زنانہ آواز: اور اس طرح بدایوں کو اپنے نام کا حصہ بنا کر غزل کے بادشاہ شکیل بدایونی اس شہر کو تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ کے لئے امر کر گئے۔ اردو دنیا اور خاص طور سے اُردو شاعری میں دلچسپی رکھنے والے کسی بھی فرد کی آخری سانس تک شکیل کے نام کے ساتھ بدایوں کا شہر ایک تخلیقی علامت بن کر اُبھرتا رہے گا۔

یہ اُداس اُداس چہرے یہ حسین حسین تبسم
تری انجمن میں شاید کوئی آئینہ نہیں ہے!

......ہلکی موسیقی کی ایک لہر......!

مردانہ آواز: شکیل بدایونی نے 1936ء میں ہائی سکول کا امتحان پاس کیا، اور پھر 1942ء میں بی۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد دلی آ گئے محکمہ سپلائی میں ملازمت اختیار کی، یہاں وہ 1946 تک رہے اور اسی دوران اپنے ہی خاندان میں سلمٰی نامی لڑکی سے ان کا نکاح ہوا۔ انہوں نے پہلی بار 5 فروری 1938ء کو سنیٹ جانس کالج آگرہ کے سالانہ مشاعرہ میں حصہ لیا اور پہلے ہی مشاعرہ میں انعام کے حقدار بھی پائے گئے۔

(......ہلکی موسیقی اُبھرتی ہے اور فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے......)

زمانہ آواز: شکیل بدایونی کو حفیظ جالندھری کی وساطت سے لاہور کی ادبی محفلوں میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ مشاعروں میں حصہ لے کر وہ کافی مقبول ہوئے، نئے رجحانات سے متاثر ہو کر انہوں نے نئی غزلیں تخلیق کیں، علی گڑھ میں پانچ سالہ قیام نے شکیل کی شاعری کو کندن بنا ڈالا۔ میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، فانیؔ، اصغرؔ اور جگرؔ کے کلام کے مطالعے نے شکیل کی شخصیت، سوچ اور شاعری پر گہرا اثر ڈالا۔ شکیل مرحوم جگرؔ مراد آبادی سے بہت متاثر تھے............وہ کہتے ہیں۔

مردانہ آواز: ”حضرت جگر مراد آبادی سے ملنے اور اُن کے فکر و نظر سے فیضاب ہونے کا

موقع ملا، اُن کی شاعری نے میرے ذوق میں انقلاب پیدا کیا۔"

فلم درد سے شکیل بدایونی کا تحریر کردہ گیت سنائی دیتا ہے۔

ہم درد کا افسانہ دُنیا کو سنا دیں گے

ہر دل میں محبت کی ایک آگ لگا دیں گے!

(فیڈ آوٹ)

ہلکی ہلکی موسیقی کے پس منظر میں..........!

زنانہ آواز: 1946ء میں شکیل بدایونی کی زندگی میں ایک نیا موڑ آیا۔ فلم ساز اور ہدایت کار اے۔ آر۔ کاردار کی دعوت پر وہ ممبئی آئے اور فلمی دُنیا میں بحیثیت نغمہ نگار شمولیت اختیار کی۔ اسی دوران اُن کی شعری تخلیقات رعنائیاں، رنگینیاں اور شبستان کے نام سے شائع ہوئیں، نعتوں کا ایک مجموعہ "نغمہ فردوس" کے عنوان سے شائع ہوا۔

موت ہی آجائے کاش ایسے جینے سے

عاشق ہو کر بھی دور ہوں مدینے سے

مردانہ آواز: شکیل بدایونی کی شعری تخلیقات پڑھ کر اُن کے ذہنی سفر کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے، یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ اُن کی ادبی زندگی دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک فلمی اور دوسری غیر فلمی، اُن کی فلمی داستان بہت طویل ہے، ان کی فلمی زندگی بڑی اہمیت کی حامل ہے، انہوں نے فلمی شاعری کو ایک نیا موڑ دیا، ایک روپ دیا، نئے تجربے کئے لمحاتی اور داخلی تجربے..........

زنانہ آواز: اُن کی فلمی شاعری میں مختلف علامتیں ملتی ہیں، نفیس اور لطیف علامتیں، وجدانی اور تخلیقی علامتیں۔

فلم مغل اعظم سے اس نعت کے چند اشعار..........

اے مرے مشکل کشا فریاد ہے

آپ کے ہوتے ہوئے دنیا میری برباد ہے

بے کس پر کرم کیجئے سرکار مدینہ
گردش میں ہے تقدیر بھنور میں ہے سفینہ

(فیڈ اوٹ)

ہلکی موسیقی اُبھرتی ہے!

زنانہ آواز: اپنے فلمی سفر کے تعلق سے شکیل بدایونی صاحب لکھتے ہیں۔

مردانہ آواز: جولائی 1946ء میں مجھے ممبئی سے حکیم مرزا حیدر بیگ دہلوی کا خط ملا۔ جس میں لکھا تھا کہ ایک پروڈیوسر سے میں نے بات کی ہے وہ تم کو اپنی کمپنی میں گیت نگار کی حیثیت سے رکھنا چاہتے ہیں، ممبئی میں حکیم صاحب نے پروڈیوسر سے ملوایا، وہ اے آر کاردار تھے، کاردار صاحب مجھے ساتھ لے کر اسٹوڈیو آ گئے اور مجھے نغمہ نگار کی حیثیت سے چار سو روپے ماہوار پر رکھ لیا، یہاں میری ملاقات میوزک ڈائریکٹر نوشاد علی سے ہوئی اور ہماری پہلی ملاقات عمر بھی کی دوستی میں بدل گئی۔ میری پہلی ہی فلم ''درد'' کے گانے اس قدر مقبول ہوئے کہ ملک بھر میں میرا نام ہو گیا۔

زنانہ آواز: اور اُس کے بعد شکیل بدایونی نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ 1960ء میں شکیل صاحب کو فلم ''چودھویں کے چاند'' کے گیتوں پر پہلا ایوارڈ ملا۔ 1961ء میں اُن کے تحریر کردہ گیت ''حسن والے تیرا جواب نہیں'' پر انعام ملا۔ 1962ء میں شکیل بدایونی کو ایک اور انعام سے نوازا گیا۔ اس ایوارڈ کا تعلق فلم بیس سال بعد کے گیتوں سے ہے۔ 1966ء میں بہترین فلم شاعر کا ایوارڈ ملا۔ ان کے علاوہ گیتوں کے سفر میں شکیل بدایونی کو بہت سارے انعامات سے نوازا گیا۔ 1964ء میں اہل بدایوں نے انھیں ایک اہم عزاز سے نوازا۔

ہلکی موسیقی اُبھرتی ہے اور فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے!

اور پھر یہ گیت سنائی دیتا ہے۔

موہے پنگھٹ پر نندلال..........

مردانہ آواز: شکیل بدایونی نے بہت سارے مقبول فلموں کے نغمے قلم بند کئے۔اُن میں چند فلمیں ہیں۔درد، ناٹک، انوکھی ادا، دل لگی، امیر، ہزار راتیں، چور بازار، شاعر، لیلیٰ مجنون، حور عرب، چودھویں کا چاند، مستانہ، گھونگھٹ، نازنین، یادیں، دیدار، بابل، آن، بیجو باورا، اڑن کھٹولہ، امر، شباب، مدر انڈیا، کوہِ نور، سوہنی مہینوال، مغل اعظم، گنگا جمنا اور جان پہچان..........

زنانہ آواز: شکیل بدایونی نے بے شمار گیت لکھے، ان کی فلموں کی تعداد ان گنت ہے انہوں نے مختلف فلمی موسیقاروں کے ساتھ کام کیا لیکن نوشاد علی اور شکیل بدایونی کی جوڑی ایک معروف جوڑی تصور کی جاتی ہے نوشاد کی موسیقی شکیل کے گیت اور کامیابی یقینی۔

مردانہ آواز: شکیل ذاتی طور پر ایک شریف النفس انسان تھے، ان کی شرافت کی وجہ سے سب ان کی عزت کرتے تھے..........ایکسٹرا سے فلم سٹار تک......
فلم بوائے سے لے کر ہدایت کار اور فلم ساز تک......

راضی ہوں یا خفا ہوں جو کچھ بھی ہوں شکیل
ہر حال میں مقبول ہے اُن کی خوشی مجھے..........

(ہلکی موسیقی اُبھرتی ہے اور فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے)

زنانہ آواز: شکیل بدایونی کی غزلوں، نغموں اور نظموں میں زندگی کا تصور پاکیزہ اور سادہ ہے، اُن کی رومانی شاعری میں..........فلمی یا غیر فلمی شاعری میں ماضی کا احساس ہے اور نئی قدروں کا احترام بھی..........انہوں نے گہرے روایات کی روشنی میں اپنے فن کو سنوارا اور نکھارا..........جمالیاتی قدروں کی تشکیل کی۔

شاید آغاز ہو پھر کسی افسانے کا
حکم آدم کو ہے جنت سے نکل جانے کا

ہلکی ہلکی موسیقی اُبھرتی ہے........

مردانہ آواز: شکیل بدایونی کی شاعری میں سادگی اور پُرکاری پہلی خصوصیت ہے، ان کی آواز، ان کے سوچنے کا انداز، اوران کا لب ولہجہ اُن کے شعری پیکروں میں نمایاں ہیں..........

زنانہ آواز: اُن کی شاعری، اُن کی رومانی مزاج کی آئینہ دار ہے......

مردانہ آواز: فلمی شاعری کو انہوں نے ایک مقام دیا..........ایک منفرد اور اعلیٰ مقام

زنانہ آواز: انہوں نے بہت سارے فلمی گیتوں اور گانوں کے لئے کلاسیکی رجحان اپنا کر ایک نیا موڑ دیا۔

فلم بیجو باورا سے ایک گیت..........

اور پھر فیڈ اوٹ..........!

مردانہ آواز: شکیل بدایونی نے فلمی نغمہ نگاری میں عوامی زندگی اور احساسات کا زیادہ خیال رکھا ہے، وہ اپنے فلمی نغموں میں سماجی مسائل کو ترجیحی طور پر پیش کرتے رہے ہیں۔ اپنے افکار اور خیالات کو عوامی ذہن سے آشنا کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں اور ایک اہم بات تو یہ ہے کہ انہوں نے جن فلموں کے لئے نغمے لکھے ان میں اکثر فلمیں سماجی موضوعات پر مبنی ہیں..........

......ہلکی موسیقی اور فیڈ اوٹ......

زنانہ آواز: اب سے کوئی پچاس برس قبل فلمی گیتوں پر مبنی ایک کتاب شائع ہوئی تھی ....نام تھا..........دھرتی کو آکاش پکارے........اس کتاب کا پیش لفظ اداکاری کے بادشاہ دلیپ کمار نے لکھا ہے......وہ لکھتے ہیں......"

شکیل صاحب کے دور میں فلمی دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک شاعر غزل و گیت لکھ رہا تھا اس کے باوجود ان کا سحر انگیز کلام لوگوں کو مدہوش و دیوانہ بنائے ہوئے تھا......؟

......ہلکی موسیقی اُبھرتی ہے......

مردانہ آواز شکیل بدایونی کی شخصیت ایک آئینہ جیسی تھی اور شاید شکیل بدایونی نے اِسی آئینہ میں بہت سارے آئینے دیکھے تھے اور پہلے آئینے میں اپنے آپ کو اور دوسرے آئینے میں اپنے اندر کے شاعر کو پہچان لیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ بدایوں کی بے چراغ بستی میں آج بھی ایک چراغ جل رہا ہے جو پورے ملک میں روشنی بکھیر رہا ہے مرحوم شکیل بدایونی کی صورتیں اُن کے تحریر کردہ نغموں کی صورت میں...... دونوں فلمی اور غیر فلمی نغمے...... گیت...... غزلیں...... گیت سنگیت کی دنیا روشن ہے ان کے نام سے..........

فلم گنگا جمنا سے ایک گیت کے بول

......اور فیڈ اوٹ..........!!



ملکہ ترنم نور جہاں

آوازیں:

ایک مردانہ آواز

ایک زنانہ آواز

......ہلکی ہلکی موسیقی اُبھرتی ہے اور فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے اور اس کے فوراً بعد گلوکارہ اور فلم اداکارہ نور جہاں کی آواز میں گیت کے بول سنائی دیتے ہیں ؎

آواز دے کہاں ہے

دنیا میری جوان ہے

گیت کے بول فیڈ اوٹ ہو جاتے ہیں اور اس کے فوراً بعد نور جہاں کی اپنی آواز سنائی دیتی ہے............

یہ آواز بھی فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے

مردانہ آواز: ملکہ ترنم نور جہاں کے نام سے کون واقف نہ ہوگا............اُس کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں............وہ اپنے وقت، اپنے زمانے............اپنے دور کی کوئی معمولی شخصیت نہ تھی......بحیثیت اداکارہ بے حد مقبول اور مشہور تھی۔ بحیثیت گلوکارہ وہ سرفہرست تھی......اُس کی آواز میں آگ کی تپش تھی اور شبنم کی پھوار بھی............وہ اپنے حلقہ احباب میں میڈم کے نام

سے جانی جاتی تھی۔

......ہلکی ہلکی موسیقی اُبھرتی ہے......

زمانہ آواز: بادامی آنکھوں والی نور جہاں کی نہ صرف آواز خوبصورت تھی پُرسوز اور پُر درد تھی، مٹھاس سے بھرپور تھی، نمکینی لذت سے مالا مال تھی بلکہ وہ جسمانی طور پر بھی بہت سندر تھی، پُرکشش تھی..........سراپا حسن تھی۔

......ہلکی ہلکی موسیقی اُبھرتی ہے......

مردانہ آواز: نور جہاں جب اپنے والدین کے ساتھ پہلی بار ممبئی آئی تو وہ صرف چودہ برس کی تھی، ایک معصوم سی، پیاری سی لڑکی..........زندگی کی اُونچ نیچ سے ناواقف، ناآشنا......سوچنے سمجھنے کا بھی زیادہ شعور نہ تھا۔لیکن فلمی دنیا میں اُس کا گرم جوشی سے استقبال ہوا، ہر جانب سے خوش آمدید کی آوازیں اُبھریں۔

(ہلکی موسیقی اُبھرتی ہے اور فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے)

مردانہ آواز: فلمی دنیا میں جو پہلا شخص اس کی زندگی میں آیا وہ شوکت حسین رضوی تھا ....نور جہاں کے والدین اُن کی دوستی یا اس قربت سے ناخوش تھے، انھیں شاید یہ صورت حال دیکھ کر اپنے خواب مٹتے نظر آرہے تھے......اُن کے خوابوں میں پیسوں کی فراوانی تھی......زندگی کی آسائیشیں تھیں، لیکن نور جہاں رضوی صاحب سے شادی کرنے کے لئے بے تاب تھی۔......

زنانہ آواز: کچھ عرصہ کے لئے یہ شادی اس وجہ سے رک گئی تا کہ وہ فلم انڈسٹری میں اپنے پاؤں جما سکے......والدین کے لئے کچھ کما سکے..........لیکن محبت کو دوریاں پسند نہ تھیں اُن کے درمیان دوری کا راستہ جلد ہی ختم ہو گیا اور اُن کی آپسی محبت شادی میں بدل گئی..........

......ہلکی موسیقی کی لہر......

مردانہ آواز: ممبئی میں اپنے قیام کے دوران ملکہ ترنم نے بہت ساری فلموں میں کام کیا،

یہ فلمیں کامیابی کی منزل کو چھو بھی گئیں، ان گنت گیت اور نغمے گائے ......عوام کے ذہنوں میں قطرہ قطرہ شہد گھول دیا............ فلم انمول گھڑی اپنے زمانے کی ایک لاجواب فلم ثابت ہوئی......نور جہاں کی آواز میں لگائے اس فلم کے گیت آج بھی کانوں میں رس گھولتے ہیں۔

(فلم انمول گھڑی سے نور جہاں کی آواز میں کسی ایک گیت کے بول......)

فیڈ اوٹ۔ ہلکی موسیقی اُبھرتی ہے

مردانہ آواز: شوکت حسین رضوی نے فلم جگنو بنانے کا اعلان کیا۔ اس میں نور جہاں کو ہیروئن اور دلیپ کمار کو ہیرو کا رول دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ فلم جگنو کی شوٹنگ کے دوران دلیپ کمار نور جہاں میں دلچسپی ظاہر کرنے لگے لیکن نور جہاں نے اپنی کوئی دلچسپی ظاہر نہ ہونے دی شاید اس وجہ سے کہ فلم پر کوئی اثر نہ پڑے......

(ہلکی موسیقی کے پس منظر میں دلیپ کمار کی آواز اُبھرتی ہے......اور فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے......)

زنانہ آواز: اور پھر ہندوستان کی فلمی نگری میں اپنی اداکاری اور آواز کا جادو جگانے کے بعد نور جہاں رضوی صاحب کے ساتھ پاکستان چلی گئی اور یہاں مستقبل طور پر سکونت اختیار کی...... پاکستان آ کر نور جہاں نے ہندوستان میں کمائی اپنی ساری پونجی رضوی صاحب کے حوالے کر دی، اس کمائی سے انہوں نے شاہ نواز سٹیڈیو کی بنیاد ڈالی، نور جہاں نے پاکستانی فلموں میں کام کرنا شروع کیا دوسروں کے لئے اپنی آواز دی......

مردانہ آواز: پاکستان فلم ''چن وے'' میں نور جہاں نے فلم اداکار جہانگیر کے مد مقابل کام کیا...... فلم بے حد کامیاب رہی......

(فلم چن دے سے نور جہاں کی آواز میں گیت کے بول اُبھرتے ہیں اور

پھر فیڈ اوٹ ہو جاتے ہیں۔)

مردانہ آواز: فلم چن وے کے بعد فلم ڈوپٹہ بنی، وہ خوب چلی۔ اس فلم میں نور جہاں نے نہ صرف لاجواب گیت گائے بلکہ لاجواب اداکاری بھی کی......

زنانہ آواز: فلم کا ہیرو سنتوش کمار تھا جسے پاکستانی فلموں کا دلیپ کمار کہا جاتا تھا۔ ڈوپٹہ کی کامیابی کے بعد نور جہاں کو امتیاز علی تاج نے فلم ''گلزار'' کے لئے سائن کیا، ابھی فلم بن ہی رہی تھی کہ شوکت حسین رضوی کو نور جہاں اور سنتوش کمار کا ملنا جلنا پسند نہیں آیا......

مردانہ آواز: اُن دونوں کے درمیاں آہستہ آہستہ دوریاں بڑھتی گئیں......اور بقول نور جہاں......

زنانہ آواز: یوں تو ہم ایک دوسرے سے جڑے رہے لیکن ایک دوسرے سے بہت دور چلے گئے۔

(ہلکی موسیقی کے پس منظر میں نور جہاں کی آواز اُبھرتی ہے......)

مردانہ آواز: پاکستان میں قیام پذیر ہونے کے بعد نور جہاں جب بھی ہندوستان آئی تو اُس کا ہر سطح پر والہانہ استقبال ہوا...... فلمی دنیا اور فلمی دنیا سے باہر بھی لتا منگیشکر نور جہاں سے بہت قریب تھی، دونوں ایک دوسرے کے قدردان تھے، ایک دوسرے کی آواز کے شیدائی تھے۔

(ہلکی موسیقی اور فیڈ اوٹ......)

زنانہ آواز: پھر نور جہاں کی زندگی میں پاکستانی فلموں کا ایک غیر معروف ایکٹر اعجاز آ گیا، نور جہاں سے شادی کرتے ہی وہ فلمی دنیا میں ایک نام بن گیا، اس نے بہت سارا دھن کمایا، میڈم نور جہاں بھی خوب کمائی کر رہی تھی۔ دونوں نے مل کر پنجاب پکچرز کے نام سے اپنا فلم ساز ادارہ بنایا۔

مردانہ آواز: نور جہاں کے بطن سے اعجاز کی تین بیٹیاں پیدا ہوئیں، اس طرح سے چھ بچوں کی ماں بن گئی......ان میں سے تین شوکت حسین رضوی کے تھے، دو

بیٹے اور ایک بیٹی......اسی دوران اعجاز کی زندگی میں فردوس نامی ایک عورت آگئی اور اُس نے نور جہاں کو طلاق دے دی۔

(نور جہاں کی آواز میں کسی فلم سے چند مکالمے (اگر ممکن ہو)......یا نور جہاں کی آواز میں کوئی فلمی یا غیر فلمی گیت اور فیڈ اوٹ۔)

مردانہ آواز: نور جہاں کو کرکٹ کے کھیل میں کافی دلچسپی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس دلچسپی کی وجہ اپنے زمانے کا معروف کھلاڑی نذر محمد تھا......اچھا کرکٹ کھیلنے کی وجہ سے نور جہاں اُس کی فین بن چکی تھی......

زنانہ آواز: چہرے کا تاثر تو زمانے کے لئے ہے
پڑھیئے میری آنکھوں میں جو پیغام لکھے ہیں......!

ہاں واقعی نور جہاں کی آنکھوں میں ان گنت پیغام لکھے نظر آتے تھے لیکن انہیں سمجھنے، پرکھنے یا دیکھنے والا شاید کوئی نہ تھا۔ وہ مرد بھی نہیں جو اُس کی زندگی میں آئے۔

مردانہ آواز: آہستہ آہستہ نور جہاں اعصابی طور پر بیمار رہنے لگی، مزاج میں چڑچڑا پن آگیا وہ خود کو بوڑھی تصور کرنے لگی، اپنے آپ کو سنبھالنے کے لئے وہ اپنے ملک سے باہر چلی گئی لیکن جب لوٹ کر آگئی تو وہ پُرسکون تھی۔

زنانہ آواز: اور دوبارہ فلموں میں کام کرنے لگی۔

مردانہ آواز: اور جب نور جہاں نے دوبارہ فلموں میں کام کرنا شروع کیا تو اُس کی زندگی میں یوسف خان نامی ایک شخص آیا۔ یوسف خان نے فلم سوہنی مہیوال بنائی، خود بھی فلم میں کام کیا، مہینوال کا رول ادا کیا اپنی سوہنی نور جہاں کے مقابلے میں......لیکن فلم ناکام ہوئی اور اس ناکامی کے ساتھ ہی یوسف خان نور جہاں کی زندگی سے دور چلا گیا......

زنانہ آواز: حالانکہ سوہنی مہیوال بنانے سے پہلے دوستی اور پھر ہیر رانجھا جیسی سپر ہٹ فلمیں بنا کر یوسف خان نے کافی دولت اکٹھا کر لی تھی۔ ان دونوں فلموں

نے نور جہاں کے گائے ہوئے گانوں کی وجہ سے ریکارڈ توڑ بزنس کیا تھا۔

(فلم ہیر رانجھا (پاکستانی) یا کسی اور فلم سے نور جہاں کی آواز میں گائے گئے کسی خوبصورت سے گیت کے چند بول اور پھر فیڈ اوٹ......!)

مردانہ آواز: یوسف خان سے دوری کے بعد وہ ایک بار پھر زندگی کی دوڑ میں اکیلی رہ گئی۔

زنانہ آواز: اب وہ بہت تھک چکی تھی، عمر بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اُس کے ساتھ حسن بھی ڈھلتا جا رہا تھا......اور آواز......شاید وہ بھی دم توڑ رہی تھی۔

مردانہ آواز: نہیں، نور جہاں ضرور بوڑھی ہوتی جا رہی تھی لیکن اُس کی آواز میں اب بھی دم خم تھا، سوز تھا، مٹھاس تھی......آواز کبھی نہیں مرتی ہے......

......ہلکی موسیقی اور فیڈ اوٹ......

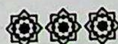
زنانہ آواز: مقبولیت، شہرت، شرافت، سخاوت اور امارت والی نور جہاں کی شخصیت......اب ہمارے درمیاں نہیں......دلوں اور ذہنوں پر اپنی آواز سے جادو جگانے والی اب اس دنیا میں نہیں......لیکن آج بھی سنگیت کی دنیا میں اُس کا اپنا ایک نام ہے۔

مردانہ آواز: اور اس نام کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ آج بھی اُس کی آواز زندہ ہے...... آج بھی سنگیت کی دنیا میں اس کی آواز جوان ہے۔ ے

دنیا میری جوان ہے

(گانا ختم ہونے کے ساتھ فیڈ اوٹ......)

The End



کیفی اعظمی

آوازیں

ایک مردانہ آواز

ایک زنانہ آواز

پس منظر میں ہلکی ہلکی موسیقی اُبھرتی ہے اور فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے، پھر کیفی اعظمی کے تحریر کردہ ایک گیت سے یہ چند اشعار سنائی دیتے ہیں

کبھی آگے کبھی پیچھے کوئی رفتار ہے یہ......

ہم کو رفتار آہنگ بدلنا ہوگا............

راستے گھوم کے دب جاتے ہیں منزل کی طرف
ہم کس رُخ سے چلیں ساتھ ہی چلنا ہوگا۔!

(آواز دھیمی ہو کر فیڈ اوٹ)

زنانہ آواز: سید اطہر حسین رضوی اُردو شعر و ادب کی دنیا میں کیفی اعظمی کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ کم و بیش سٹھ سال تک اُنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ انسان دوستی، مساوات، مظلوموں کے ساتھ ہمدردی اور بے کسوں اور بے بسوں کے ساتھ گم گساری کا جو پیغام موثر اور دلنیشن انداز میں پیش کیا وہ ہر تعلق سے لافانی ہے ادب اور فلم دونوں ہی حوالوں سے زندگی کے منظر نامے کو بدلنے اور اس میں اپنے خوابوں

کے مطابق رنگ بھرنے کی جو مسلسل جدوجہد انہوں نے کی وہ ناقابل فراموش ہے۔

بہار آئے تو میرا اسلام کہہ دینا
مجھے تو آج طلب کر لیا ہے صحرا نے

......موسیقی کی لہر......

زنانہ آواز: بہت پرانی بات ہے کسی نے کیفی صاحب سے پوچھا. کچھ بتا دیجئے اپنے بارے میں. کیفی صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا

مردانہ آواز: کب پیدا ہوا یاد نہیں، کب مروں گا معلوم نہیں لیکن اپنے بارے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں محکوم ہندوستان میں پیدا ہوا، آزاد ہندوستان میں بوڑھا ہوا اور شوسلسٹ ہندوستان میں ہی مروں گا۔

زنانہ آواز: کیفی اعظمی 1925ء میں موضع مجواں ضلع اعظم گڈھ اُتر پردیش یں ایک چھوٹے موٹے زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں ہوئی، عربی، فارسی اور اُردو کی اعلیٰ تعلیم لکھنو اور الہ آباد میں حاصل کی۔

مردانہ آواز: شاعری کا ذوق وشوق اُنھیں ورثے میں ملا تھا۔ اُن کے والد سید فتح حسین فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ اس لئے گھر میں شعر وشاعری کا موحول بنا رہتا۔ اُن کے تین بڑے بھائی بھی شاعر تھے۔

......ہلکی موسیقی......

زنانہ آواز: کہا جاتا ہے کہ کیفی اعظمی صرف گیارہ سال کی عمر میں جب گھر کے مردانے سے زنان خانے اور زنان خانے سے مردانے کے چکر لگاتے شعر بھی کہہ جاتے تھے۔

......ہلکی موسیقی......

مردانہ آواز: کیفی اعظمی نے صرف بارہ سال کی عمر میں بہرائچ کے ایک مشاعرہ میں

اپنی غزل سنا کر اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا اس غزل کو بعد میں بیگم اختر نے اپنی آواز دے کر مالا مال کر دیا۔ اس مشاعرہ کے فوراً بعد والدِ محترم نے خوش ہو کر اپنے بیٹے کو ایک تخلص کیفی سے نوازا جو بعد میں کیفی اعظمی ہو گیا۔

......بیگمِ اختر کی آواز میں کیفی اعظمی کا گیت......

مردانہ آواز: کیفی اعظمی روشنی کا مینار تھے، انسانیت کی سرفرازی کے لئے اٹھنے والی آواز تھے، وہ ایک تحریک تھے۔ ایک انجمن تھے۔ اپنی زندگی کے شروع کے زمانے میں کیفی اعظمی انقلابی قومی تحریک کے پُر جوش حامی بن گئے ترقی پسند تحریک کا ایک حصہ بنکر اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا اور انہوں نے ہمیشہ اپنے نصب العین کو اپنی خواہشات سے بلند رکھا۔

زنانہ آواز: اپنی سوچوں، اپنے خیالات اور اپنے نظریات کو کیفی اعظمی نے اپنی اندر کے حساس شاعر اور مستحکم قوت ارادی رکھنے والی شخصیت کے ساتھ جس طرح ہم آہنگ کیا اور اپنے اصولوں کو اپنی ضرورت پر ترجیح دی وہ قابل تقلید ہے۔

زندگی جدو جہد میں ہے صبر کے قابو میں نہیں
نبضِ ہستی کا لہو کانپتے آنسوں میں نہیں۔!

......ہلکی موسیقی......

مردانہ آواز: ملک کے ایک معروف خاکہ نگار پروفیسر ظفر احمد نظامی کیفی اعظمی کا خاکہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ وہ خوابوں کا صورت گر تھے، اہل دل اور صاحب نظر تھے، سپنوں کو حقیقت میں ڈھالتے تھے، دوسروں کے دکھ بانٹتے تھے، انہوں نے تنگ دستی سے رشتہ جوڑا، قید و بند سے بھی نہ منہ موڑا، پھولوں پودوں کے درمیان موت سے لڑتے رہے، زندگی کے لئے جھگڑتے رہے، جب تک رہے آن بان سے رہے......!

......ہلکی موسیقی......

زنانہ آواز: اُردو زبان کی ترقی و ترویج کے تعلق سے کیفی اعظمی کے تاثرات سننے سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے۔

......ہلکی موسیقی پسِ منظر میں......

مردانہ آواز: اُردو مقبول ترین زبان ہے اور زیادہ سمجھی جاتی ہے، کارخانوں، ملوں، بس اسٹاپ اور ریل گاڑیوں میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ اُردو ہے، افسوس کہ اس زبان کے رسم الخط سے کثیر تعداد نا آشنا ہے۔ مجھے محفلوں اور مشاعروں کی توسط سے زیادہ پہچان ملی ہے۔ مطبوعہ تخلیقات کے ذریعہ کم لوگ جانتے ہیں، میرے سننے والے زیادہ ہیں اور پڑھنے والے کم۔ فلم کے مکالموں اور نغموں نے اُردو زبان کو مقبول عام بنایا ہے۔

......گیت......

زنانہ آواز: کیفی اعظمی کی پہلی نظم لکھنو سے شائع ہونے والے جریدے سرفراز میں بس شائع ہوئی اور پھر اُن کی نظمیں جنگ میں شائع ہونے لگیں۔ لیکن وہ تو نہ اپنا نام اور نہ ہی پتہ لکھتے تھے۔ بعد میں ایک مشاعرے میں علی سردار جعفری نے انہیں ڈھونڈ نکالا اور سجاد ظہیر سے ملوایا۔ سجاد ظہیر نے کیفی اعظمی کو بمبئی چلنے کی فرمائش کی۔ وہ تیار ہوئے اور بمبئی چلے آئے جہاں وہ کمیونسٹ پارٹی کے کل وقتی ممبر بن گئے۔ یہ ۱۹۴۳ء کا دور تھا۔ اُن کی نظموں پر مشتمل پہلا مجموعہ ''جھنکار'' کے نام سے ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا۔ جو ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔

مردانہ آواز:
راستہ بھول گیا یا یہی منزل ہے میری
کون لایا ہے کہ خود آیا ہوں معلوم نہیں
کہتے ہیں حُسن کی نظریں بھی حسین ہوتی ہیں
میں بھی کچھ لایا ہوں کیا لایا ہوں معلوم نہیں

......ہلکی موسیقی......

زنانہ آواز: یہ ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ حیدر آباد کے ایک مشاعرے میں کیفی اعظمی کی ملاقات شوکت خانم سے ہوئی جو بعد میں شادی کی صورت اختیار کر گئی اگر چہ اس شادی کی مخالفت بھی ہوئی لیکن فتح محبت کی ہی ہوئی اور اُس دور کے معروف قلم کاروں کی موجودگی میں شوکت خانم کا نکاح کیفی اعظمی سے پڑھوایا گیا جوش ملیح آبادی، علی سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، اسرار الحق مجاز اور سکندر علی وجد اس شادی کی تقریب میں شامل ہوئے۔

......ہلکی موسیقی ابھرتی ہے......

مردانہ اواز: کیفی اعظمی نے مالی حالت سے تنگ آکر اور بڑھتے ہوئے اخراجات کو نظر میں رکھتے ہوئے فلموں میں گانے لکھنے شروع کئے۔ شاہد لطیف نے اپنی فلم ''بزدل'' کے لئے کیفی اعظمی سے دوگانے لکھوائے جن کا معاوضہ ایک ہزار روپیہ کیفی اعظمی کو ملا۔

زنانہ آواز: ان ہی دنوں اِن کے ہاں شبانہ اعظمی پیدا ہوئی۔

مردانہ آواز: آہستہ آہستہ کیفی صاحب کو فلموں میں نغمہ نگاری کا کام ملنے لگا اور اُن کی مالی حالت بہتر ہونے لگی مگر انہوں نے پارٹی کا کام پھر بھی نہ چھوڑا۔

فلم بزدل سے ایک گیت

مردانہ آواز: کیفی اعظمی کا پہلا مجموعہ کلام جھنکار کے نام سے ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا۔

زنانہ آواز: دوسرا مجموعہ کلام آخرِ شب ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔

مردانہ آواز: تیسرا مجموعہ کلام آوارہ سجدے ۱۹۶۳ء میں منظر عام پر آیا۔

زنانہ آواز: چوتھا مجموعہ ''میری آواز سنو'' کے نام سے ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ یہ فلمی نغموں پر مشتمل ہے۔

مردانہ آواز: ابلیس کی مجلس شوریٰ ۱۹۷۰ء میں بازار میں آئی۔

زنانہ آواز: ان کی آخری کتاب سرمایہ کے نام سے ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئی۔

......ہلکی موسیقی......

مردانہ آواز: فلم بزدل کے بعد کیفی اعظمی نے گورودت کی فلم کاغذ کے پھول اور موہن سہگل کی فلم اپنا ہاتھ جگن ناتھ کے لئے گانے قلم بند کئے۔ رمیش سہگل کی فلم شعلہ و شبنم کے گانے بھی کیفی اعظمی نے تحریر کئے اور بے حد مقبول ہوئے۔ اتنے برس گزرنے کے بعد بھی یہ گانا آج بھی بہت مقبول ہے۔

زنانہ آواز: جانے کیا ڈھونڈتی رہتی ہے یہ آنکھیں مجھ میں
راکھ کے ڈھیر میں شعلہ ہے نہ چنگاری ہے
(فلم شعلہ و شبنم کا یہی گانا سنائی دیتا ہے)

مردانہ آواز: سید سجاد ظہیر کیفی اعظمی کو اُردو شاعری کا سرخ پھول قرار دیتے ہیں۔

زنانہ آواز: کیفی اعظمی ایک نئے نظریئے سے عورت کو اپنے اشعار میں پیش کرتے رہے ہیں۔ وہ اپنے مشن میں عورت کو بھی ساتھ چلنے کے خواہاں تھے۔

مردانہ آواز: اُٹھ میری جان میرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے
تیرے قدموں میں ہے فردوسِ تمدن کی بہار
اُٹھ میری جان......
اپنی تاریخ کا عنوان بدلنا ہے تجھے

......ہلکی موسیقی اُبھرتی ہے......

مردانہ آواز: کیفی اعظمی کو ملے انعامات کی تعداد اُنیس (۱۹) سے زیادہ ہے لیکن چند انعامات کا ذکر لازمی ہے۔ انہیں چار بار فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا اُن کی تخلیق آوارہ سجدے پر سویٹ لنیڈ نہرو ایوارڈ ملا۔ انہیں ساہتہ اکادمی کا ایوارڈ بھی ملا۔ دلی سرکار کی اُردو اکادمی نے ملینیم ایوارڈ سے نوازا اور وہ لائف ٹائیم اچیومنٹ ایوارڈ بھی حاصل کر چکے ہیں۔

زنانہ آواز: دوسرے اہم انعامات میں فلمی اور ثقافتی خدمات کا پدم شری کا خطاب بھی شامل ہے جو انہوں نے اُردو کے ساتھ جانبدارانہ رویہ اپنانے کے خلاف واپس کر دیا۔

فلم کاغذ کے پھول ایک گیت

مردانہ آواز: چیتن آنند کی فلم حقیقت آج بھی لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہے ریاست بھر میں یہ فلم اس لحاظ سے کافی پسند کی گئی کیونکہ اس فلم کا ایک بڑا حصہ لداخ میں فلمایا گیا۔ اس فلم کے گانے کافی مقبول ہوئے۔

زنانہ آواز: ہیر رانجھا...... چیتن آنند کی یہ فلم کیفی اعظمی کا ایک شاندار کارنامہ مانا جاتا ہے۔ اس فلم کے سارے مکالمے کیفی اعظمی نے منظوم لکھے ہیں۔

(فلم ہیر رانجھا سے چند مکالمے......)

مردانہ آواز: فلم گرم ہوا کی کہانی، مکالمے اور منظر نامہ کیفی اعظمی کے لکھے ہوئے ہیں۔ کمال تو یہ ہے اس فلم کے لئے کیفی اعظمی کو تین انعامات ایک ساتھ ملے تھے...... کہانی کے لئے، مکالموں کے لئے اور منظر نامہ کے لئے۔

......ہلکی موسیقی......

زنانہ آواز: کیفی اعظمی کے فلمی نغموں کا انداز جداگانہ ہے اور آج بھی یہ فلمی نغمے دل کی تاروں کو چھیڑتے ہیں۔

مردانہ آواز: کر چلے ہم فدا جان تن ساتھیو

زنانہ آواز: کیفی اعظمی نے قریب قریب دوسو فلموں کے لئے نغمے لکھے ہیں۔

......ہلکی موسیقی......

مردانہ آواز: موت کا اک دن معین ہے۔ ۱۰ مئی ۲۰۰۲ء بروز جمعہ کیفی عظمی ۷۷ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ بابا اعظمی اُن کے بیٹے ہیں اور شبانہ اعظمی اُن کی بیٹی۔ دونوں مل کر اپنے والدِ محترم کے ادبی اور فلمی مشن کو

فروغ دینے میں مصروف ہیں۔

......ہلکی موسیقی......

مردانہ آواز: کیفی اعظمی اب ہمارے درمیان موجود نہیں، وہ ہم سے ہمیشہ کے لئے دور چلے گئے......لوٹ کر نہ آنے کے لئےلیکن اُن کی آواز آج بھی ہمارے آس پاس سنائی دیتی ہے۔

کیفی اعظمی کی زبان میں اُن کا نغمہ

فیڈ اوٹ

The End



داور، ماہا، علینہ، زینب، آیت اور ارسلان
کے لئے
رب سے ہماری دعا ہے حاصل ہو
اُوجِ ثریا کا مقام!

بچوں کی دنیا

۱۔ بدی اور نیکی

۲۔ ماں

بدی اور نیکی

راوی: کہتے ہیں کہ ایک بڑی سی مرغی نے ایک بڑے سے ٹوکرے میں بہت سی گھاس پھوس اکٹھا کی اور اس نرم نرم سی گھاس پر بیٹھ کر بہت سے سفید سفید انڈے دیے اور پھر دن رات انڈوں پر بیٹھنا شروع کیا ایک ہفتہ گذرا، دو گذرے، تین گذرے اور کہیں اکیسویں دن جا کر یہ انڈے کھٹ کھٹ ٹوٹنا شروع ہوئے۔ ہر انڈے سے ایک ننھا منا سا چوزہ نکلا ان کے چھوٹے چھوٹے پر تھے، یہ چوزے نازک تھے، خوبصورت تھے، ہر چوزہ روئی کا گالا دکھائی دیتا تھا، مرغی خوش تھی پر وہ پریشان بھی تھی ایک انڈا رہ گیا تھا جس سے ابھی کچھ بھی نہ نکلا تھا، بے چاری ماں اس کو اپنے پروں سے گرمی پہنچاتی رہی اور پھر ایک دن اس میں سے بھی ایک ایسا ہی بچہ نکلا، ایک ننھا سا چوزہ...... پر اس چوزے کی ایک ہی ٹانگ تھی، ایک ہی آنکھ تھی، یہ چوزہ بے حد شریر تھا، ایک دن اپنی ماں کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

چوزہ: اماں میں گھر میں نہیں رہوں گا میں جا رہا ہوں یہاں سے بادشاہ کا محل دیکھنے کے لئے اور پھر وہاں جا کر بادشاہ سلامت سے بھی ملوں گا۔

مرغی: ارے میرے پیارے، میرے ننھے لنگڑو، کیسی باتیں کرتا ہے، مجھے ایسی باتوں سے ڈر لگتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو چاہیے کہ آرام سے گھر پر رہیں اور اپنی ماں کے پروں کے نیچے گرم گرم راتیں بسر کریں۔

چوزہ: نہیں، میں جا رہا ہوں۔

مرغی: رُک جا۔ رُک جا۔ تمہارے لئے آگے جانا مشکل ہو گا۔

چوزہ: مشکل کیوں۔

مرغی: تمہاری صحت، تمہارے جسم کی بناوٹ، تم تھک جاؤں گے۔

چوزہ: جو تھکتے ہیں وہ آگے بڑھ نہیں سکتے، میں جا رہا ہوں، مجھے خوشی خوشی جانے دو۔

مرغی: کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔

چوزہ: ہاں، خدا حافظ

(موسیقی)

راوی: اور پھر وہ چوزہ اچک اچک کر لنگڑاتے ہوئے نکل گیا، ایک جگہ آگ جل رہی تھی، وہ جلتی ہوئی آگ کے قریب آیا اپنے آپ کو گرم کیا اور جب جانے لگا تو آگ بول اٹھی۔

آگ: میاں لنگڑے ذرا اپنی ننھی سی چونچ سے چند تنکے اٹھا لا اور مجھے دے دو تا کہ میں ذرا دیر تک جل سکوں اور اس راستے سے گزرنے والے کو گرمی دے سکوں۔

چوزہ: نہیں میرے پاس وقت نہیں، میں جلدی میں ہوں۔

آگ: کیسی جلدی، کہاں جانا ہے تجھ کو۔

چوزہ: بادشاہ سلامت سے ملنے۔

آگ: تم اور بادشاہ سلامت...... تم ہوش میں ہو نا۔

چوزہ: ہاں میں جو کہہ رہا ہوں ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں۔

آگ: ذرا لمحہ بھر رک اور میری مدد کر۔

چوزہ: نہیں، میں کسی کی مدد نہیں کرتا۔

(موسیقی)

راوی: کچھ اور آگے چل کر چوزے کو ایک چھوٹا سا چشمہ دکھائی دیا، اسے پیاس لگی تھی پہلے اس نے اپنی پیاس بجھائی پھر ادھر ادھر دیکھا، چشمے کا پانی راستے کی جانب بڑھ رہا تھا جس کی وجہ سے چلنا دشوار بن رہا تھا۔

(موسیقی)

چشمہ: بجھ گئی تمہاری پیاس، میرا پانی تو بہت ٹھنڈا ہے۔

چوزہ: ہاں پیاس بجھ گئی۔

چشمہ: میاں لنگڑے میرا ایک چھوٹا سا کام کردے۔

چوزہ: کیسا کام۔

چشمہ: دیکھو میرے راستے میں یہ دو چار کنکر پڑے ہیں جن کی وجہ سے پانی سڑک کی طرف جا رہا ہے، ان کنکروں کو اپنی چونچ سے ہٹا دو تاکہ میں آرام سے بہہ سکوں۔

چوزہ: میں یہ کام نہیں کرسکوں گا مجھے ابھی دور جانا ہے بادشاہ کا محل دیکھنے کے لئے اور بادشاہ سلامت سے ملنے کے لئے۔

(موسیقی)

راوی: بھلا یہ لنگڑا چوزہ کسی کی بات کبھی سنتا ہے، سنی ان سنی کر کے آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ شکر ہے کہ اس کی صرف ایک ہی ٹانگ ہے اگر دونوں ٹانگیں ہوتیں تو شاید...... یہ خود ہی بادشاہ سلامت بننے کا اعلان کرتا۔ بہرحال ابھی بادشاہ کا محل دور تھا۔ چلتے چلتے اسے کانٹوں سے بھری ایک جھاڑی ملی جھاڑی کے کانٹوں میں ہوا کا دامن پھنس گیا تھا اور وہ ادھر ادھر نکل کر چلا رہی تھی اس نے مرغی کے بچے کو دیکھا تو بولی...... "میاں لنگڑے مسافر مجھ پر رحم کر اور مجھے اس جھاڑی سے نکال اس کے کانٹے تیز ہیں مگر حسبِ معمول میاں لنگڑے نے ایک نہ سنی، اپنا سر ہلا کے ہوا سے بھی جلدی کا بہانہ بنا کر آگے چل دیا اور کودتے پھاندتے بادشاہ کے محل پہنچ گیا، اسی دوران بادشاہ کا باورچی ایک چوزہ پکڑنے نکلا تھا بادشاہ سلامت کے ناشتے کے لئے اس نے میاں لنگڑے کو اچکتے دیکھا تو جھٹ سے پکڑ لیا اور دیگچی میں ڈال کر دیگچی کو آگ پر چڑھا دیا میاں چوزے نے چلا کر کہا۔

(موسیقی)

چوزہ: دہائی ہے۔دہائی ہے۔آگ بادشاہ سلامت کی دہائی ہے۔مجھے مت جلاؤ۔

آگ: نہیں نہیں میں تمہاری کوئی مدد نہیں کروں گی جب مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑی تھی تو تم جلدی میں تھے اور اب مجھے جلدی ہے۔

(موسیقی)

راوی: اتنی دیر میں باورچی لوٹ آیا اس نے ڈھکن اٹھا کر دیکھا تو اسے چوزہ پسند نہیں آیا، کیونکہ اس کی صرف ایک ٹانگ تھی اور اگر بادشاہ دوسری ٹانگ کے بارے میں پوچھ لیتا تو شاید اس کی بات پر کوئی یقین نہیں کرتا، باورچی نے چوزے کو دیگچی سے نکال کر باہر پھینک دیا۔باورچی خانے میں پانی کی نالی تھی، لنگڑا چوزہ اس کے پاس گیا۔

(موسیقی)

چوزہ: میاں پانی تمہیں بادلوں کی قسم، مجھے ذرا ٹھنڈا کر بالکل جل گیا ہوں۔

چشمہ: لنگڑے چوزے جب مجھے تمہاری ضرورت تھی تو تم جلدی میں تھے اور تم نے میری مدد کرنے سے انکار کیا تھا، حالانکہ اس وقت بھی میں نے تمہاری پیاس بجھائی تھی۔

چوزہ: یہ دیکھو یہاں سے ہوا بھی آرہی ہے،......ڈر ہے کہ ہوا کا جھونکا مجھے باہر پھینک دے گا۔ارے ہوا میری مدد کر......مجھ پر رحم کھا......میں اس شہر میں اجنبی ہوں میرا یہاں کوئی نہیں۔

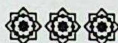
ہوا: یاد ہے نا جب میں نے تم سے مدد کے لئے التجا کی تھی اور اب......تم مجھ سے مدد چاہتے ہو......اپنے آپ کو عقل مند سمجھتے ہو اور مجھے بیوقوف......اور پھر ابھی تو تم نے بادشاہ سلامت سے بھی ملنا ہے۔

چوزہ: نہیں، میں اب کسی سے بھی ملنا نہیں چاہتا ہوں......مل کر مجھے کیا ملے گا۔

ہوا: اور میرے پاس بھی وقت نہیں ہے......میں جارہی ہوں۔

(موسیقی)

راوی: اور یہ کہتے ہوئے ہوا نے اوپر کا رخ کیا تو میاں چوزہ ایک مینار کی چوٹی پر جا کر اٹک گیا اور ابھی تک وہیں پر لٹکا ہوا ہے اور اب مرغی کا کوئی اور بچہ اگر اس کے پروں سے نکل کر ادھر ادھر چلا جاتا ہے تو وہ دکھیاری مرغی ٹھنڈی سانس بھرتی ہے اور ان سب کو لنگڑے بھائی کا قصہ سناتی ہے۔ اس کی خود غرضی کی کہانی۔ دوسروں کی مدد نہ کرنے کی داستان...... کسی نے سچ ہی کہا ہے کر بھلا ہو بھلا...... تم دوسروں کا بھلا چاہو، دوسرے خود تمہارا بھلا چاہیں گے۔!!!



ماں

راوی: ایک چھوٹا سا لڑکا تھا...... نام تھا کلوا۔ اس کی ایک عادت تھی جب کسی کو کام کرتے دیکھتا تو کہتا...... میں بھی یہی کروں گا۔ میں بھی...... میں بھی...... اور ایک دن وہ گھر میں اکیلا تھا ماں گھر سے باہر کھیتی باڑی کرنے گئی تھی، گھر کے کونے میں ایک چابک پڑا تھا اس نے چابک اٹھایا اور گھر سے باہر آ کر ایک پتھر پر مارنے لگا...... جانے کیسے یہ پتھر ایک گھوڑا بن گیا...... گھوڑا ذرا جھکا......

گھوڑا: آؤ بیٹھ جاؤ

کلوا: (گھوڑے پر بیٹھتے ہوئے) کہاں جائیں گے۔

گھوڑا: جہاں تم چاہو...... چلیں

کلوا: چلو

گھوڑا: لگام زور سے سنبھال لو کلوا...... گر جاؤ گے تو ہڈیاں پسلیاں ایک ہو جائیں گی۔ کلوا نے زور سے لگام پکڑ لی اور گھوڑا سرپٹ دوڑنے لگا۔ ایک اونچے پہاڑ پر چڑھا اور دوسری طرف سے اُتر کر ایک جنگل میں رُک گیا۔ یہ ایک عجیب طرح کا جنگل تھا، اس کے پیڑ چھوٹے چھوٹے تھے، وہاں سے گزرنا مشکل تھا۔

گھوڑا: اب آگے جانا مشکل نظر آتا ہے، اب اُترو میاں کلوا۔

کلوا: واہ...... میں تو آگے جاؤں گا...... چلو آگے چلو۔

راوی: اور کلوا چابک مارنے لگا۔ گھوڑے کو غصہ آیا وہ زور سے اُچھلا اور میاں کلوا دھڑام سے گر گئے اور پیدل بھاگنے لگے اور بھاگتے بھاگتے ایک سمندر کے نزدیک جا

پہنچے……

کلوا: میں……میں سمندر میں جاؤں گا……مچھلیاں پکڑوں گا۔

یہ کہتے ہوئے کلوا نے سمندر میں چھلانگ لگائی ایک سنہری مچھلی اس کے ٹانگوں کے بیچ میں آ کر ٹھہر گئی۔

کلوا: آہا……میں سواری کروں گا۔

مچھلی: سواری نہیں تم تیرو گے میرے ساتھ

راوی: اور پھر مچھلی نے ایسا گہرا غوطہ لیا کہ اس نے سمندر کی تہہ کو چھو لیا۔ وہاں طرح طرح کی سیپیاں تھیں۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کیا لیکن اس کا دم گھٹنے لگا۔

کلوا: (چلاتے ہوئے) بس……بس……اوپر چلو میرا دم گھٹتا ہے۔

مچھلی اوپر آئی اور ابھی کلوا نے پانی سے سر نکالا ہی تھا کہ ایک بڑا سا پرندہ آیا اور کلوا کو اپنی چونچ میں اٹھا لیا۔

کلوا: اب تو میرے پر آ گئے ہیں اب تو میں اُڑوں گا۔

پرندہ: نہیں اب سونے کا وقت ہے۔

کلوا: نہیں میں نہیں سوؤں گا۔ میں اور اُوپر جاؤں گا، آسمان کے اندر جاؤں گا۔

پرندہ: لیکن میں وہاں نہیں جا سکتا۔ تم جانا چاہتے ہو تو بادلوں کے ساتھ جاؤ۔

راوی: اور پھر پرندے نے اپنا رُخ موڑا……سامنے سے کچھ بادل آ رہے تھے، انہوں نے لپک کر کلوا کو اپنی گود میں لے لیا، بادلوں کی گود بڑی ٹھنڈی تھی……نرم نرم سی……بادل کلوا کو لے کر جب چلنے لگے تو کلوا کو لگا جیسے اس کے گالوں پر دو بوندیں گریں……گرم گرم بوندیں……

کلوا: یہ بوندیں……لگتا ہے میری ماں کے آنسو ہیں۔

بادل: ہاں بیٹا، یہ تیری ماں کے آنسو ہیں وہ تیری تلاش کرتے کرتے تھک چکی ہے اور اب ایک پیڑ کے سائے میں بیٹھی بہت رو رہی ہے……میں نے اُسے دیکھا تو یہ

دو آنسو ساتھ لیتا آیا......اب خاموش ہو جاؤ......ہم آسمان کی جانب جا رہے ہیں۔

کلوا: (چلا کر) نہیں۔ میں نہیں جاؤں گا۔ مجھے اپنے گھر لے چل......اپنی ماں کے پاس۔

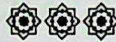
راوی: اور بادل بہت تیزی سے نیچے آیا اور ایک جگہ رُک کر کلوا کو نیچے گرا دیا......وہ ایک پیڑ کے سامنے گرا......وہاں اس کی ماں بانہیں پھیلائے کھڑی تھی......

کلوا: ماں

ماں: میرا جگر......مرا بیٹا، تو کہاں چلا گیا تھا۔

کلوا: میں آ گیا ہوں ماں، اب کہیں نہیں جانوں گا۔

(موسیقی اور فیڈ اوٹ)



سیلابی کہانیاں

کشمیر سیلاب ستمبر ۲۰۱۴ کی نذر

بدنامی

اور جب اُن کی محبت انتہا کو چھو گئی تو دونوں کو شدت سے اس بات کا احساس ہونے لگا کہ اب اُن کی شادی ہونی چاہیے لیکن دونوں اس بات پر متفق تھے کہ شادی کے لیے اُن کے گھر والوں کی رضامندی ضروری ہے۔ دونوں نے اپنے طور پر اپنے والدین سے بات کی۔ انہیں اپنی محبت کا احساس دلایا اور پھر والدین کی ملاقات کے لیے جگہ اور وقت کا تعین ہوا۔ لڑکے کے والد غلام علی پہلے آئے۔ ان کے فوراً بعد لڑکی کے والد حسن احمد بھی تشریف لائے۔ رسمی ملاقات کے بعد حالات حاضرہ پر تبصرہ ہوا اور باتوں ہی باتوں میں اصل بات چلی تو لڑکے کے والد غلام علی نے کہا۔

''حضور ہم ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنا ایک چھوٹا سا گھر ہے۔ جہاں میں میری بیوی اور میرا بیٹا رہتے ہیں۔ میں بحیثیت اُستاد ایک سرکاری اسکول میں کام کرتا ہوں اور اپنی تنخواہ سے نہ صرف اپنی گھریلو ذمہ داریوں کو نبھاتا ہوں بلکہ اسی تنخواہ کے سہارے اپنے بیٹے کے تعلیمی اخراجات پورے کر کے اُسے تعلیم کے زیور سے آراستہ بھی کر چکا ہوں۔''

''اور کوئی ذریعہ آمدن...... زمین، زراعت...... باغ، باغیچہ۔'' حسن احمد نے جاننا چاہا۔

''جی نہیں لیکن اللہ کا کرم ہے کہ ابھی تک کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہ پڑی۔''

''لیکن میری بیٹی'' ، حسن احمد کہتے کہتے رُک گئے۔

''آپ کچھ کہہ رہے ہیں'' غلام علی نے کہا

''میں سوچ رہا ہوں''

''کیا سوچ رہے ہیں آپ...... میں جان سکتا ہوں۔''

''سوچ رہا ہوں، آپ کی جتنی ماہانہ آمدن ہے، اتنی رقم سے زیادہ میرے نوکر تنخواہ لیتے ہیں۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں گے۔ اللہ نے بہت کچھ دے رکھا ہے آپ کا ہمارا کوئی مقابلہ بھی نہیں ہو سکتا لیکن آپ بھی بخوبی جانتے ہیں کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں ایک دوسرے کے بغیر جی نہیں سکتے۔''

''جانتا ہوں، اسی لیے تو یہاں آیا ہوں آپ سے ملنے کے لیے...... لیکن:

''لیکن کیا؟''

''میری عزت کا سوال ہے، میرا وقار میری آن بان، لوگ کیا کہیں گے یہی نا کہ حسن احمد نے اپنی بیٹی ایک مفلس کے گھر بیاہ دی، بہت بدنامی ہوگی۔''

''میرا بیٹا پڑھا لکھا ہے۔'' احمد علی نے کہا ''اس کے پاس علم کی دولت ہے اس کا مستقبل شاندار ہے۔ آپ کی بیٹی کو ہمارے ہاں ہر طرح کا سکون ملے گا، آرام ملے گا، ایک شریفانہ ماحول ملے گا۔''

''لیکن بدنامی تو ہوگی میری اور میں اپنی بدنامی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا اور پھر آپ جانتے ہوں گے۔

''بھلا کیا۔''

''محلوں کے مکین جھونپڑیوں کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے'' یہ کہہ کر حسن احمد کو یہ جان کر بڑا دھچکا لگا کہ سب کچھ میسر ہوتے ہوئے بھی بدنامی کی پرواہ کیے بغیر اپنی محبت کی خاطر ان کی بیٹی نے اُستاد کے بیٹے کے ساتھ کورٹ میرج کر لی ہے۔ امیرانہ زندگی کو ترک کر کے ایک فقیر کے گھر میں رہنے لگی ہے۔

وقت کا پہیہ آہستہ آہستہ گھومتا رہا

ایک شام آسمان ابر آلودہ ہو گیا۔ رات اُترنے سے پہلے بادلوں نے بارشوں کا روپ اپنا لیا اور پھر بارشوں نے برسنا شروع کیا اس قدر بارشیں برسی کہ سیلاب نے ساری بستی کو گھیر لیا۔ گھروں سے باہر نکلنا دشوار ہو گیا۔ تباہی اور بربادی نے ساری بستی کو نگل لیا۔ گھر والے بے گھر ہو گئے۔ حسن احمد کا سب کچھ سیلاب کی نذر ہو گیا۔ سب کچھ بہہ گیا لیکن غلام علی کا مکان معجزاتی طور بچ گیا اور پھر حسن احمد کو بڑی مشکل سے اپنے شاندار محل کے ملبے سے نکالا گیا اور انہیں اپنی جان بچانے کے لیے بیٹی کی جھونپڑی میں پناہ لینا پڑی!!۔



سیلاب

اور پھر بارشیں برستی رہیں خوب برستی رہیں۔ پانی نے سیلاب کی شکل اختیار کی۔ پانی کے تیز بہاؤ نے ہر جانب صورت حال بدل ڈالی۔ پہچان بدل گئی سیلاب کی تباہ کاریوں نے ہر شئے، ہر چیز کو تہس نہس کر کے رکھ دیا اور پھر جب سیلاب کا پانی سرحد کے اُس پار بھی جانے لگا اور وہاں بھی تباہ کاریوں کا آغاز ہوا تو اُس پار سے ایک آواز ابھری۔

''یہ سازش ہے ہمارے خلاف پانی کو روکنے کی بجائے جان بوجھ کر اس کا رُخ ہماری طرف موڑ دیا گیا تا کہ اُن کا بچاؤ ہو اور ہم ڈوب جائیں''۔

''اس پار والے تو پہلے ہی ڈوب چکے ہیں تباہ و برباد ہو چکے ہیں، ہماری زندگی کے پھول مرجھا چکے ہیں جیتی جاگتی زندگیاں بے جان ہو چکی ہیں۔ بھلا اُن کے ڈوبنے سے ہمارا کیا فائدہ''۔

اور اس بات کی جانب کسی کا خیال نہیں گیا۔ اُس پار اور نہ ہی اس پار والوں کا کہ سرحد کے آر پار والے بھی دو نہیں بلکہ ایک ہیں!



کل شب بارش برسی

چار سال قبل جب مہاراشٹرا سے تعلق رکھنے والے انوپم ناگری اور سلو جا ہنی مون منانے کشمیر آئے تھے تو کشمیر کی خوبصورتی سے اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ اپنے پہلے بچے کی پیدائش پر وہ ایک بار پھر کشمیر آئیں گے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے پہلے بچے کی پیدائش کشمیر کی معطر فضاؤں میں ہی ہو۔ اپنے پہلے بچے کی پیدائش کیلئے انہیں چار برس تک انتظار کرنا پڑا اور جب ان کی زندگی کے باغیچے میں پھول کھلنے کے دن آنے والے تھے تو انہوں نے کشمیر کا رخ کیا۔ یہاں ایک ہاؤس بوٹ میں قیام پذیر ہوگئے۔ گھومتے پھرتے زندگی کا بھرپور لطف اٹھایا۔ ڈاکٹری مشورہ کے بعد سرینگر کے ایک نرسنگ ہوم میں کمرہ بھی بک کیا لیکن موسم نے اچانک کروٹ بدلی۔ پہلے دھیمی دھیمی اور پھر اچانک نہ رکنے والی بے تحاشا بارش برسنے لگی کہ سیلاب کا خطرہ لاحق ہوگیا ان کے لئے ہاؤس بوٹ میں رہنا مشکل ہوگیا۔ اُن کی زندگی کی روشنی بجھنے لگی۔ ڈل جھیل کی گہرائیوں میں اس قدر...... ارتقاش پیدا ہوگیا کہ ہاؤس بوٹ ہلنے لگے اور انہیں لگا کہ وہ اب اپنے ہونے والے بچے کی صورت بھی نہ دیکھ سکیں گے۔

آس پاس کے ہاؤس بوٹ خالی ہونے لگے۔ اپنے ہاؤس بوٹ کے مالک کی مدد سے وہ ایک ناؤ کے ذریعہ جھیل کے کنارے سڑک پر آنے میں کامیاب ہوگئے۔ وہاں پہلے ہی لوگوں کا ایک بڑا ہجوم تھا۔ مرد، زن اور بچے۔ اُن میں وہ بھی شامل ہوگئے اور دوسرے لوگوں کے ساتھ وہ بھی ایک بڑے سے مکان کے ایک بڑے سے آنگن میں پناہ لینے لگے۔ اچانک سلو جا درد سے تڑپنے لگی۔ ساتھ میں کھڑی چند کشمیری عورتوں نے اس کا حال جاننا چاہا تو انہیں فوراً ہی اس بات کا احساس ہوگیا کہ سیاح خاتون ماں بننے والی ہے۔ برستی بارش میں وہ اُسے بڑے مکان سے منسلک ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئیں۔

کچھ عورتیں پہلے ہی وہاں بارش سے بچنے کیلئے موجود تھیں۔ پھر کچھ عرصہ بعد اندر سے نوزائیدہ بچے کی ایک معصوم سی آواز سنائی دی۔ خاتون باہر آئی اور اونچی آواز میں کہا:۔

''انوپم جی کون ہیں۔ کہاں ہیں؟''

''میں ہوں'' وہ قریب آکر بولا۔

''مبارک ہو بیٹا ہوا ہے۔ آپ اندر جا سکتے ہیں۔ آپ کی بیوی آپ کیلئے پریشان ہو رہی ہیں''۔

انوپم ناگری رک رک کر، ڈر ڈر کر کمرے کے اند گیا۔

''خوش نصیب ہے آپ کا بیٹا۔ اس کا جنم یہاں ہوا۔''

''یہ کون سی جگہ ہے اور سامنے جو بڑا مکان نظر آرہا ہے ہو کس کا گھر ہے۔''

''وہ ہم سب کا گھر ہے۔''

''کیا مطلب میں نہیں سمجھا''

''خدا کا گھر ہے......''

''خدا کا گھر؟''

''ہاں مسجد شریف ہے۔''

اور اسی دوران مسجد کی بلند مینار سے ایک آواز سنائی دی۔ ''اللہ اکبر''

انوپم ناگری اپنی بیوی اور نوزائیدہ بچے کو دیکھنے کے بعد اُن خواتین کی جانب دیکھنے لگا جو اس کے لئے غیر تھیں، اجنبی اور انجانی تھیں لیکن جنہوں نے اپنا بن کر اپنے دکھ درد کو بھلا کر اس کی بیوی اور بچے کی جان بچا لی تھی...... وہ سوچنے لگا کہ اُن کے بچے کو پیدائش کیلئے کتنی پاک جگہ نصیب ہوئی کشمیر میں..........!''۔

وہ مسکراتے ہوئے کمرے سے باہر آیا۔

مسجد کے اندر اور باہر آنگن میں درد و کرب اور بے یقینی کے ماحول میں بہت سارے لوگ نماز پڑھنے میں مصروف تھے!

بارش اب تھم چکی تھی!

میٹھی تنہائی کا غم

شاید وہ جینے کیلئے مجبور تھا ورنہ مرنا اس کے لئے مشکل نہ تھا۔ وہ جینا چاہتا تھا اس ایک لمحے کی خوشی کیلئے جب اس کے بیٹے لوٹ کر آئیں گے اس کے پاس اور یہی سوچ سوچ کر جب اس نے اپنے مکان کی تیسری منزل کی ایک کھڑکی کھول کر باہر کی جانب دُور دُور تک اپنی نظریں دوڑائیں تو اُسے احساس ہوا کہ بارشیں نہ جانے کب کی تھم چکی ہیں لیکن سیلاب اپنی تباہ کاریوں کو چھو چکا ہے اور قیامت خیز سیلاب نے زندگی کی ایک ایک شئے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے زندگی کے سارے منہ بولتے آثار ڈوب چکے ہیں۔ اگرچہ اس کا مکان ذرا اونچائی پر تھا لیکن اس کی پہلی منزل پانی میں ڈوب چکی تھی، اپنی ستر (70) سالہ زندگی کے شب و روز اور ماہ و سال کی کتاب میں اس نے ایسا بدترین سیلاب کبھی بھی نہ دیکھا تھا۔ وہ اپنے گھر میں تنہا رہتا تھا۔ اپنے بائیس (22) سالہ خالق کے ساتھ اپنی رفیقہ حیات کی وفات کے بعد خالق ہی اس کی دیکھ بھال کرتا تھا گھریلو ذمہ داریاں نبھاتا تھا۔ خالق جو کلکتہ کا رہنے والا تھا ایک دوست کی مدد سے اس کے ہاں نوکر بن کر آیا تھا لیکن اس نے کبھی بھی خالق کو ایک نوکر کی نظر سے نہیں دیکھا۔ اب وہ یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ سیلاب آنے سے پہلے برستی بارش میں خالق سودا سلف لانے کیلئے مارکیٹ گیا تھا لیکن لوٹ کر نہ آسکا۔ اس کے جانے کے بعد سیلاب نے ایک ایسا رُخ اختیار کیا کہ آنا جانا چلنا پھرنا ناممکن بنتا گیا۔ نہ دن کو چین اور نہ رات کو نیند، بے ہنگم چنگاریاں جیسے اس کے جسم کو جلا رہی تھیں۔ دو سال قبل جب اس کی رفیقہ حیات انتقال کر گئی اور اکیلے پن کا ناگ اُسے ڈسنے لگا تھا تو اس نے کتابوں کی دنیا میں اپنے آپ کو گم کر دیا۔ پڑھنا لکھنا تو ویسے بھی اس کی زندگی

کا حصہ تھا۔ وہ بحیثیت ایک یونیورسٹی پروفیسر نوکری سے سبکدوش ہوا تھا۔ وہ اپنے وقت کا ایک قابل اُستاد مانا جاتا تھا ایک دانشور ایک مفکر، ایک قلمکار، تعلیمی نقطہ نگاہ سے اس کی کئی تحقیقات منظر عام پر آچکی تھیں۔ تب وہ اکیلا نہ تھا، اس کی بیوی حیات تھی۔ وہ دو ہونہار بچوں کا باپ تھا۔ اپنے بچوں کو تعلیمی زیور سے سجانا سنوارنا میاں بیوی کی زندگی کا واحد مقصد تھا۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوئے لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ اپنے روشن مستقبل کی تلاش میں وہ انہیں اور اپنے وطن کو چھوڑ کر جائیں گے، کسی اجنبی دیش کو اپنائیں گے۔ اب وہ گذشتہ پانچ برسوں سے کنیڈا میں قیام پذیر تھے دونوں کو من پسند جاب ملا تھا۔ اچھی خاصی سیلری ملی تھی۔ بڑے بیٹے نے دفتر ہی کے ایک ساتھی کی بہن سے شادی کر لی تھی۔ اور چھوٹے بیٹے نے ایک ایسے کشمیری گھرانے میں شادی کی جو گذشتہ تیس برسوں سے کنیڈا میں رہتے تھے۔ ان کی لڑکی بھی کینیڈا میں ہی پیدا ہوئی تھی ان پانچ برسوں میں دونوں بھائی ایک بار چند دنوں کیلئے کشمیر آئے تھے۔

وہ جب اپنی بستی کے دوسرے لڑکوں کو دیکھتا تو اس کے دل میں ایک کسک سی اُٹھتی اور اُسے اپنے لاڈلوں کی بہت یاد آتی۔ آج جب سیلاب میں سب کچھ بہتا جا رہا تھا تو اُسے اپنے بیٹے بے تحاشا یاد آرہے تھے۔ لیکن یہ بے تحاشا محبت، یہ بے تحاشا یاد اُسے سوچنے پر مجبور کر رہی تھی کہ اگر اس کے بیٹے یہاں ہوتے تو نہ جانے انہیں کون سی سیلابی آفت کا سامنا کرنا پڑتا۔ اچھا ہی ہوا وہ یہاں نہیں ہیں۔ وہ شاید اس طغیانی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اپنے آپ کو بچا نہ پاتے، شاید مجھے بھی بچا نہ پاتے لیکن میرا کیا ہے، یہاں میرا کون ہے۔ مر بھی گیا۔ سیلاب کی نذر بھی ہو گیا۔ تو...... اس نے ایک بھی آہ بھرتی ایک بار پھر دور اپنی نظریں دوڑائیں اور اسے لگا جیسے دور سے ایک ناؤ سیلاب کے بڑھتے پانیوں سے ٹکراتی ہوئی آہستہ آہستہ اس کی جانب آرہی ہے۔ اس ناؤ کو دو نوجوان کھینے میں مصروف تھے۔ اسے لگا جیسے اس کے بیٹے اس کی جانب بڑھ رہے ہیں اس کی تلاش میں اس کی حفاظت کیلئے۔ ناؤ قریب تر آتی گئی اور جب کھڑکی کے قریب پہنچی تو اس نے دیکھا ناؤ میں واقعی دو لڑکے ہیں...... ایک خالق اور دوسرا ؟!

''خالق تم ٹھیک ہو'' وہ چلایا۔

''ہاں ٹھیک ہوں صاحب آپ کیلئے پریشان تھا، بڑی مشکل سے ہم لوگ یہاں تک آسکے ہیں...... بچنے کی کوئی اُمید نہ تھی لیکن اللہ نے ہماری مدد کی......''

''تم نے یہ خطرہ کیوں مول لیا''۔

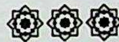
''آپ کیلئے...... میرا آپ کے بغیر کون ہے؟''

''اور میرا......'' وہ سوچنے لگا......'' میرا بھی کون ہے خالق کے بغیر۔''

''یہ میرا دوست احمد ہے۔ آپ نہیں جانتے۔ ہمارے دودھ والے کا بیٹا ہے۔ اب آپ آرام سے نیچے آجائیں پانی کا بہاؤ بڑھ رہا ہے آپ کا یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔''

آیئے۔ ہمارے ہاتھ زور سے تھام لیجئے............''! احمد نے کہا

اُن کے ہاتھ تھامتے ہوئے اُسے لگا جیسے خالق اور احمد کے روپ میں اس کے اپنے بیٹے لوٹ کر آئے ہوں......!



پھول اور آندھی

سڑک کے کنارے چھوٹے سے باغیچے کے سامنے سے گزرتے ہوئے ہر آنے جانے والے کی نگاہیں ایک لمحے کے لیے جم سی جاتیں۔ باغیچہ میں ایک چھوٹا سا پودا دیکھ کر بڑی حیرانی ہوتی تھی۔ اس چھوٹے سے پودے کی صرف دو ٹہنیاں تھیں ایک ٹہنی سوکھی ہوئی تھی اور دوسری ٹہنی سرسبز اور تروتازہ...... اللہ کی عظمت دیکھئے سوکھی ہوئی ٹہنی پر ایک بڑا سا سرخ گلاب مسکراتا اور اپنے آس پاس خوشبو بکھیرتا ہوا نظر آتا تھا۔ اس کے برعکس سرسبز ٹہنی پر ایک بجھا بجھا سا خزان زرد پتہ زندگی کی ویرانیوں کا احساس دلاتا تھا۔ سوکھی ہوئی ٹہنی پر گلاب کا پھول اور سرسبز ٹہنی پر سوکھا ہوا پتہ۔ شاید اسی لیے آنے جانے والوں کی نگاہیں جم سی جاتی تھیں...... اور ایک روز ایسا ہوا۔ آندھی چلی، زبردست آندھی، ایک طوفان اٹھا، ہر شئے تہس نہس ہوگئی، سوکھی ٹہنی پر کھلے گلاب کے پھول کی پنکھڑیاں جانے کہاں بکھر گئیں۔ سرسبز ٹہنی پر لٹکا ہوا بے جان پتہ اُڑتے سنبھلتے پانی کے ایک تالاب میں جا گرا اور تالاب کی تہہ میں پوشیدہ ہوگیا۔ آندھی رُکی، طوفان تھم گیا، ہر سمت سکوت چھا گیا۔ آنے جانے والوں نے دیکھا کہ پودا اپنی دو برہنہ ٹہنیاں لیے اپنی جگہ پر کھڑا ہے سڑک کے کنارے اس باغیچہ کے سامنے سے گزرنے والے ایک لمحے کے لیے رُک جاتے اور سوچنے لگتے کہ اتنے بڑے طوفان سے گزرنے کے بعد اس پودے کی دو ٹہنیوں پر کیا اب کی بار گلاب کے پھول مسکرائیں گے یا سوکھے پتّوں کی اُداسیاں باغیچے کو اپنی لپیٹ میں لیں گی!



نور شاہ کی تخلیقات

ایک جھلک

افسانوی مجموعے

بے گھاٹ کی ناؤ

ویرانے کے پھول

ایک رات کی ملکہ

من کا آنگن اُداس اُداس

گیلے پتھروں کی مہک

بے ثمر سچ

آسمان پھول اور لہو

کشمیر کہانی

...

ناول/ناولٹ

پائل کے زخم

نیلی جھیل کالے سائے

آدھی رات کا سورج

لمحے اور زنجیریں

آؤ سو جائیں؟

...

انتخاب اردو ادب......۱۹۴۷ء تا ۱۹۷۱ء

...

دوسری تخلیقات

بند کمرے کی کھڑکی (ڈائری کے اوراق)

کہاں گئے یہ لوگ (ادبی خاکے)

جموں و کشمیر کے اردو افسانہ نگار

(تعارف، فن اور مکالمہ)

...

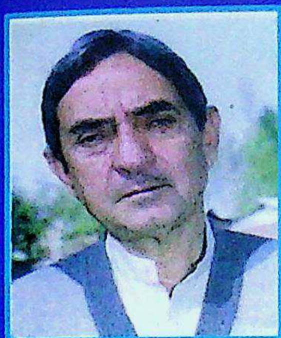
کشمیر نامہ۔ تحریر مرحوم عمر مجید

مرتب: نور شاہ/ جاوید ماٹجی

نور شاہ کے تین ناولٹ

مرتب: روف راحت

...



یہ بات باعث طمانیت ہے کہ ریاست میں نور شاہ اہم افسانہ نگار ہیں جو تجزیہ پسندی اور جدت کاری کو بروئے کار لاتے ہیں۔ یہ معمولی بات نہیں کہ وہ اپنے افسانوں کو روایت کی زنجیروں میں جکڑ بند ہونے نہیں دیتے بلکہ افسانے کے پہلے ہی جملے سے بیان کنندہ زندہ اور متحرک ہو جاتا ہے اور چند ہی جملوں کے بعد اپنے لکھنے والے کی تحکیم اور منشا کو مسترد کر کے خود ہی اپنا راستہ بناتا ہے اور جو افسانہ خلق ہوتا ہے وہ زبان کی شگفتگی، جملوں کی خود تر شیدگی، شعریت آمیزی، طنز اور تضاد سے جمالیاتی تجربے میں ڈھل جاتا ہے اور اس تجربے میں متکلم یا راوی افسانے کی رگ و پے میں لہو کی طرح رواں ہوتے ہوئے بھی اپنی انفرادیت قائم رکھتا ہے۔

پروفیسر حامدی کاشمیری